رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۳۰

ذی الحج ۱۳۷۳ھ — جلد ۴۱ عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ — لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے — قیمت فی پرچہ دس آنے

پوتے کی وراثت کا
مسئلہ

کچھ مدت سے ہمارے ملک میں اسلامی فقہ کے خلاف یہ شور برپا تھا کہ وہ وراثت کے معاملے میں یتیم پوتوں کے ساتھ انصاف نہیں کرتی ان شور مچانے والوں میں پیش پیش وہ لوگ ہیں جنہیں پوتے کی وراثت کے مسئلہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے بلکہ وہ اس مسئلہ کی آڑ میں اور یتیم پوتے کی مظلومی کا نام لے لیکر یہ ساری دہائی اس لئے مچارہے ہیں کہ اس طرح درحقیقت وہ حدیث و فقہ کے اس تمام ذخیرہ کو جو پچھلی ساڑھے تیرہ صدیوں میں فراہم ہوا ہے محض ایک دفتر بے معنی قرار دینا چاہتے ہیں اور اس کی بنیاد پر تمام اسلامی روایات و قوانین سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ اس مسئلے کا انتخاب خاص طور پر اسی لئے کیا گیا کہ ایک طرف تو یتیم پوتے کی محرومی کا نقشہ کھینچکر عوام کے جذبات سے اپیل کرنا آسان وکارگر ہے اور دوسری طرف یہ منجملہ ان مسائل کے ہے جن پر تمام علمائے اسلام متفق ہیں خواہ وہ کسی مسلک اور کسی فقہ کے پیرو ہوں اور اگر ایک مرتبہ عام لوگوں کے یہ ذہن نشین کرادیا جائے کہ تمام جلیل القدر صحابہ اور سارے ائمہ مجتہدین جنمیں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام غزالی، امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ جیسے لوگ شامل ہیں یہ سب کے سب ”جاہل ملا“ تھے کہ وراثت کے ایک معمولی سے مسئلے میں قرآن کی رہنمائی کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھ سکے تو پھر بہت آسانی سے پورے ذخیرہ حدیث و فقہ اور تفسیر و تعبیر کو ان کی نظروں میں بے وقعت ٹھہرایا جاسکے گا اور ان نئے مجتہدین کے لئے راستہ صاف ہوجائے گا جو نبی صلی اللہ علیہ و سلم کے لائے ہوئے اسلام کو ادھیڑ کر نئے سرے سے اپنے ڈیزائن اور اپنی تراش خراش کا ایک اسلام تیار کرنا چاہتے ہیں

پوتے کی وراثت کے مسئلے پر

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان کا یہ پمفلٹ اس مہم کے اصل پس منظر کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ نفس مسئلہ کی حقیقت کو پوری طرح واضح کرتا ہے اور تفصیل کے ساتھ ان دلائل کو پیش کرتا ہے جن کی بنیاد پر علماء امت نے پوتے کے حق وراثت کو تسلیم نہیں کیا۔ قیمت چھ آنے

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ۔ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۲	ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ - مطابق ستمبر ۱۹۵۴ء	عدد ۶

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ۔ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اس مرتبہ کمیونزم کے خلاف پہلے مشرقی پاکستان میں اور پھر مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں میں نہایت سخت اقدام کیا گیا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی خلاف قانون قرار دے دی گئی ہے اور اس کے تمام نمایاں کارکن گرفتار اور دفاتر سربمہر کر دیئے گئے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کمیونسٹ پارٹی کی وہ کونسی سرگرمیاں ہیں جن کی بنا پر اس کے خلاف یہ انتہائی قدم اٹھایا گیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ حکومت کے علم میں ان کی کوئی ایسی سرگرمیاں ہوں جن کے سدِّباب کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا ہو، لیکن اس سلسلے میں ابھی تک کوئی برسرِعام تحقیقات کر کے اس کے نتائج پبلک کے سامنے کھول کر نہیں لائے گئے اور نہ ہی اس سخت ترین اقدام کے حق میں کوئی عدالتی فیصلہ حاصل کیا گیا۔ اس لیے لوگوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ اقدام امریکہ کی خوشنودی کی خاطر کیا گیا ہے۔ کسی کا یہ خیال ہے کہ کمیونسٹوں سے مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کی عبرتناک شکست کا انتقام لیا جا رہا ہے، وغیر ذالک۔ لیکن جب تک اس کاروائی کا پس منظر کھل کر سامنے نہ آجائے وثوق سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔

تاہم اتنا ہم ضرور کہیں گے اور پورے زور سے کہیں گے کہ کوئی اسلامی ریاست، جو فی الواقع خدا کی حاکمیت کے نظریے پر وہ نظام استوار کرنے کے لیے وجود میں آئی ہو جس کا نقشہ کتاب و سنت میں ہمارے سامنے آتا ہے، وہ اپنے حدود میں کمیونزم جیسے ملحدانہ انقلابی نظریے کو انڈے بچے دینے کا موقع نہیں دے سکتی۔ ایک مسلم معاشرہ اپنی فطرت کے لحاظ سے اس کا روادار نہیں ہو سکتا کہ اس میں طبقاتی بنیادوں پر کشمکش اور مار دھاڑ اور خون خرابے کی تحریک چلانے کے لیے کوئی سازشی طاقت بے روک ٹوک اپنا کام کرتی رہے۔ پس اس امر میں پوری قوم متفق ہے کہ کمیونزم کو پاکستان میں پروان چڑھنے کا موقع حاصل نہیں

ہونا چاہیے۔

لیکن مختلف عناصر میں اختلاف کمیونزم کے خلاف معرکہ آرائی کے طریقوں میں ہے۔

ہمارے سرمایہ داروں اور زمینداروں کا طبقہ اور ہمارے موجودہ مسلم لیگی فرمانرواؤں کا گروہ، جو خود اسی طبقے سے برآمد ہوا ہے، کمیونزم سے نمٹنے کے لیے تین ہی تدبیروں پر بھروسہ کیے ہوئے ہے۔

ان کی پہلی تدبیرِ جنگ یہ ہے کہ جابرانہ قوانین اور ہنگامی اختیارات کے سارے ہتھیار کھول کر استعمال کیے جائیں۔

اس تدبیر کے بارے میں ہم اتنا ہی عرض کریں گے کہ مارکس کی تعلیم کے ظہور کے ساتھ ہی اس کو دبانے کے لیے اس تدبیر پر عمل شروع ہو گیا تھا اور جب سے لے کر اب تک دنیا کے ہر گوشے میں یہ عمل جاری ہے۔ غالباً لمبے چوڑے دلائل کے بغیر یہ تاریخی حقیقت آپ تسلیم کریں گے کہ کمیونزم کی رد کرنے کے لیے جن جباریوں کا مظاہرہ روس میں زار کی خداوندی نے کیا تھا ان کی حد تک آج کی کوئی حکومت بہ مشکل ہی جا سکتی ہے۔ لیکن زار کا تجربہ ناکام ہو کے رہ گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر آپ کمیونسٹ پارٹی کو خلافِ قانون قرار دینے کی انتہائی تدبیر بھی اختیار کر لیں تو بھی پارٹی کے محدود دائرے کے باہر اس کے حامیوں، ہمدردوں اور خفیہ کارکنوں کا جو وسیع حلقہ کسی نظام کے پیدا کردہ معاشی اضطراب کی باگیں تھامے خاموشی سے کام کر رہا ہوتا ہے اس پر کسی قانون کا بس نہیں چلتا۔ چند پارٹی کے گنے چنے آدمیوں کو تو کوئی حکومت گرفتار کر سکتی ہے لیکن اس کے کارکنوں کی ایک بھاری تعداد اپنی ظاہری بولی بدل کر زیرِ سطح[1] چلی جاتی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہوتا ہے جیسے آپ نے نشتر اٹھایا اور خنازیر کی چند گلٹیوں کا اپریشن کر ڈالا، لیکن جراثیم کی وہ فوج کی فوج جو نشتر کی زد سے محفوظ خون میں گردش کرتی پھرتی ہے اس کے لیے کونسا اپریشن کارگر ہو سکتا ہے بجز اس کے کہ آپ خود مریض ہی کے گلے پہ چھری پھیر دیں، ان جراثیم کا خاتمہ قابلِ تصور نہیں ہے۔ پس اس تدبیر پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت کسی خاص صورتِ حالات کے تقاضے کے طور پر جزوی حد تک تو پیش آ بھی سکتی ہے، لیکن یہ کمیونزم کو ختم کرنے کا کوئی جامع فارمولا نہیں ہے۔

---

[1] اخباری اطلاع ہے کہ مشرقی پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے بعض بڑے لیڈر روپوش ہو گئے ہیں۔

اس وقت تک خود پاکستان کا حال یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی گنتی کے چند افراد پر مشتمل ہے لیکن اس کے فلسفے پر ایمان رکھنے والوں، اس کے پروگرام سے دلچسپیاں رکھنے والوں اور اس کے ذہنی حامیوں اور ناصروں کی ایک فوج کی فوج ہے جو سرکاری محکموں، قومی اداروں، ریڈیو اور سینما کی کمپنیوں، یونیورسٹیوں ادبی انجمنوں وغیرہ میں گھسی ہوئی ہے۔ وہ ایک طرف سرکاری اور قومی پالیسیوں، پروگراموں اور فیصلوں پر اثر انداز ہوتی ہے، دوسری طرف کمیونسٹوں کو اندرونی معلومات فراہم کرتی ہے اور تیسری طرف انہیں حکومت کی تعلیمی اور سوشل اور کلچرل سرگرمیوں کے میدان میں کام کرنے کے راستے بنا بنا کر دیتی ہے۔

یہ تسلیم کہ حکومت کی کسی سخت کارروائی کے زیر اثر یہ عناصر عارضی طور پر دب جاتے ہیں، مگر کوئی قانون ان کے دل و دماغ کو بدل نہیں سکتا، کوئی تشدد ان کی ذہنی ساخت میں فرق نہیں لا سکتا، کسی مستبدانہ اختیار کے ہتھیار ان کے ایمانوں کو تحویل قبلہ پر آمادہ نہیں کر سکتے۔ یہ سالہا سال کے مطالعے، غور و فکر اور جذباتی تاثرات کے زیر اثر حاصل کردہ شعور کو سینوں میں دبائے تشدد کی ناساز گار فضاؤں میں دم سادھ کر کسی لمبی سے لمبی مدت تک پڑے رہ سکتے ہیں۔ پھر اگر معاملہ محض اندرون ملک کی ایک محدود تحریک کا ہوتا تو صورت دوسری تھی۔ یہاں حال یہ ہے کہ کمیونزم کا جال مشرق و مغرب کے ہر گوشے میں پھیلا ہوا ہے۔ اتنا ہی نہیں، کرۂ ارضی کے ایک بڑے حصے پر کمیونزم پورے ٹھنٹھے کے ساتھ راج کر رہا ہے۔ پھر سوشلسٹ حکومتوں اور دنیا کی کمیونسٹ تحریکوں اور پارٹیوں کے درمیان بین الاقوامی روابط بھی ہیں، روپے اور اسلحہ سے باہمدگر مدد بھی پہنچائی جاتی ہے، پروپیگنڈے کے محاذ پر بھی ایک دوسرے کی حمایت و تائید کی جاتی ہے اور عالمگیر دائرے میں بڑی بڑی سازشیں بھی ہوتی ہیں۔ ایسے حالات میں اندرون ملک کے کمیونسٹ عناصر کو سطح سے دبا کر نیچے تہ میں پہنچا دینا ان کے حوصلے بھی پست نہیں کر سکتا۔ پس تشدد کے سلاح سے کھلے دشمن کو چھپے دشمن میں بدل ڈالنا ہماری نگاہ میں کوئی کامیاب تدبیر نہیں ہے۔

ان کی دوسری تدبیر جنگ یہ ہے کہ کمیونزم کو امریکہ کے ڈالروں اور اسلحہ کے زور سے شکست دی جائے۔ لیکن اس تدبیر کا جو تجربہ چین میں کیا گیا ہے اور اب ہند چینی میں اپنی تکمیل کو پہنچ رہا ہے، کافی ہوگا کہ اس کا مطالعہ کر کے نتائج کو دیکھ لیا جائے۔ اتفاق سے ان دنوں ایک کتاب "کشمکش" کی ایک صدیق

(A CENTURY OF CONFLICT) میرے زیر مطالعہ ہے۔ اس میں چین کی وہ کہانی خالص امریکن نقطۂ نظر سے بیان کی گئی ہے جو کمیونسٹوں اور چیانگ کائشک کے تصادم سے وجود میں آئی ہے۔ امریکی امداد کے باوجود کومنٹانگ گورنمنٹ نے جس شان سے کمیونسٹ طاقت کے ہاتھوں زک پہ زک اٹھائی ہے اس پر جنرل مارشل نے جنوری ۱۹۴۷ء میں برسرعام اپنی بیزاری اور مایوسی کا اظہار کیا اور چین کی قومی حکومت کو پورے زور سے موردِ الزام گردانا۔ ۱۹۴۷ء کے وسط گرما میں جنرل ویڈمیئر (G. WEDEMEYER) کو مامور کیا گیا کہ وہ چین میں جاکر صورت حالات کا پورا پورا مطالعہ کرے اور پھر اپنا تجزیہ پیش کرے۔ اب جنرل موصوف کا تجزیہ حسب ذیل نکات کو پیش کرتا ہے:۔

(۱) قومی حکومت کی روزافزوں کمزوری بہت سے فوجی اور اقتصادی اسباب کا نتیجہ ہے، لیکن سب سے بڑی وجہ اسکی اپنی انتظامی نااہلیت ہے۔ کمیونسٹ خطرے پر قابو پایا جاسکتا ہے، بشرطیکہ حکومت صرف جاپان کے خالی کردہ علاقوں کو قبضے میں لینے پر اکتفا نہ کرے بلکہ ایسے دیانت دار اور اہل عہدہ داروں کا تقرر بھی عمل میں لائے جو سیاسی اور اقتصادی مضبوطی کا سروسامان کرسکیں۔

(۲) فوج بری حالت میں ہے۔ افسروں میں اپنے سپاہیوں کی خیرخواہی کا جذبہ کم ہے۔ ان دونوں کے درمیان باہمی ربط حد درجہ کمزور ہے۔ فوج کے اندر مقصدیت کی حس سرے سے نہیں اور نہ ان کو یہ شعور ہی دیا گیا ہے کہ وہ کاہے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ترقی کا دارومدار قابلیت اور اوصاف پر نہیں ہے۔

(۳) جبری بھرتی کا اسلوب نفاذ مستبدانہ ہے، امیروں اور شہریوں کے لڑکوں سے صرف نظر کیا جاتا ہے اور غریب کسان بھرتی کیے جارہے ہیں۔

(۴) فوج اور عوام کا باہمی تعلق افسوسناک ہے کیونکہ سپاہی بڑے پیمانے پر لوٹ کھسوٹ اور تشدد کی کارروائیاں کرتے پھرتے ہیں۔

(۵) اقتصادی لحاظ سے ٹیکس کا بوجھ بہت زیادہ بھی ہے اور شہریوں پر اس بوجھ کی تقسیم بھی غیر منصفانہ ہے، درآنحالیکہ ممکن الاستعمال قومی ذرائع سے جو استفادہ کیا جارہا ہے وہ ضروریات کے مقابلے میں قطعی ناکافی ہے۔

(۶) انتظامی مشینری، کیا بلحاظ تنظیم اور کیا بلحاظ کارکردگی، بد دیانتی، غیر متعین اور باہم دگر مداخلت کرنے والی ذمہ داریوں، آپس میں کھینچا تانی کرنے والے وسائط کار اور ناقص تربیت رکھنے والے کارکنوں کی وجہ سے انتہائی پست معیار پر آگری ہے۔

(۷) خفیہ پولیس نہایت وسیع پیمانے پر مستبدانہ طریقوں سے کام لے رہی ہے اور اس طرح حکومت کے متعلق عوام کا اعتماد تباہ ہو رہا ہے۔

(۸) قومی حکومت کی رہی سہی قوت افراطِ زر کا شکار ہو گئی اور اس پر قابو پانا حکومت کے بس سے باہر تھا۔ ایک حکومت جو جدید مالیاتی اور انتظامی تدابیر پر قادر نہیں ہے اور جسے اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ فوج پر صرف کرنا ہے اور وہ فوج میں کوئی کمی بھی نہیں کر سکتی، آخر افراطِ زر کی مصیبت کا توڑ کیسے کر سکتی ہے، جو کوششیں کی بھی گئیں ان کو خیانت کاریوں نے ناکام کر دیا۔ الٹا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام کے اعتماد کے تزلزل نے نقدی کی قیمت کو اور نیچے لا گرایا۔ اس کا علاج بس یہی رہ گیا تھا کہ یا تو امریکہ فوجی مصارف اپنے ذمے لے لے، یا جنگ بند کر دی جائے۔ درمیانہ طبقہ جس سے چیانگ کسی جرأت مندانہ اقدام کے لیے تعاون حاصل کر سکتا تھا، افراطِ زر کی سب سے زیادہ چوٹ اسی پر پڑی۔ اس طبقے کی مایوسی اور سیاسی بے بسی نے چیانگ کو دھکیل کر کومنٹانگ کے ناکارہ عناصر کی آغوش میں جا ڈالا جو ہر اصلاحی تدبیر کے راستے میں رکاوٹ تھے۔

(۹) اندریں حالات کمیونسٹوں کا پروپگنڈہ تیز تر ہو گیا۔ وہ ایک طرف افراطِ زر کی حالت کو سامنے لا رہے تھے، دوسری طرف امریکہ کے خلاف رائے عام کو تیار کرتے اور تیسری جنگ کی مصیبت کا احساس ابھارتے۔ خاص طور پر ان کے پروپگنڈے کی وہ لہر خطرناک تھی جس کی زد میں قوم پرست سپاہی آتا تھا۔ عام سپاہیوں کے لیے اڑھائی ڈالر ماہانہ تنخواہ مقرر تھی اور افسروں کے لیے ۴ تا ۲۰ ڈالر۔ لیکن یہ بھی باقاعدگی سے نہیں ملتی تھی۔ خوراک اور لباس کے لحاظ سے بُرا حال تھا، حد یہ کہ زخمی سپاہیوں کی دیکھ بھال اور فوجیوں کے اہل و عیال کی خبر گیری کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔ چنانچہ فوجی دستے روحِ عمل سے محروم ہو گئے اور ان میں لڑنے کا جذبہ مر گیا۔ یہاں تک ہوا کہ بغیر کسی حکم کے اپنے آپ وہ مورچوں سے پسپا ہو جاتے

اور جان بوجھ کر کمیونسٹوں کو کسی علاقے اور سامان رسد اور گولہ بارود پر قبضہ کرنے کا موقع فراہم کرتے۔

اس سلسلۂ کلام کو مصنف بطورِ خود مزید تفصیل تک لے جاتا ہے، اور پھر چند صفحات آگے جا کر داستان اس فقرے پر ختم کرتا ہے کہ "کمیونسٹ خطرے کو روکا نہیں گیا، بلکہ وہ سارے بند توڑ کر آگے بڑھ گیا جو کبھی تعمیر ہی نہیں کیے جا سکے"!

اس داستان سے سبق حاصل کرنے میں اگر کوئی کمی رہے تو اسے ہند چینی کی رودادِ کشمکش پورا کر سکتی ہے جو اپنے اختتام کے قریب آ گئی ہے۔

تیسری تدبیر جنگ جو پیش نظر ہے کہ کمیونزم کو اسلام کے محض کھوکھلے نعرے کے جادو سے شکست دی جائے۔ مدعا یہ ہے کہ بغیر اس کے کہ اسلام کو اپنے لیے قبول کیا جائے اور ملک کا نظام اس کے اصولوں کے حوالے کیا جائے، ساری جاگیرداریاں، زمینداریاں، اقتدار کی رسہ کشیاں، مسرفانہ اور عیاشانہ دلچسپیاں اور اقتصادی ناہمواریاں جوں کی توں برقرار رکھتے ہوئے اسلام کو ان کا سنتری بنا کر محل کے دروازے کے سامنے کھڑا کر دیا جائے کہ وہ ان کے باڈی گارڈ کے فرائض انجام دے۔

ہم عرض کریں گے کہ اس تدبیر کا تجربہ بھی کمیونزم کے مقابلے میں ایک مرتبہ پوری طرح کیا جا چکا ہے۔ روسی ترکستان میں مذہب اور مذہبی نعرے کا جادو اس طریق پر آزمایا جا چکا ہے مگر جو انجام وہاں پیش آیا وہ اتنا عبرتناک ہے کہ شاید چین کا تجربہ بھی ویسا عبرتناک نہ ہو۔

پھر کیا اب آپ حضرات امیرِ بخارا بن کر بیٹھنا چاہتے ہیں اور اسلام کو زندگی کے اس نظام اور ماحول کے دفاع پر بھیجنا چاہتے ہیں جو از سر تا پا اسلام سے بے نیاز، بلکہ منحرف ہے؟ کیا آپ حضرت روسی ترکستان کے جاگیرداروں اور پاشاؤں کی طرح ناجائز انتفاع کے کوڑھ کا شکار رہنے والے نظامِ معاشی کو سینے سے لگا کر قرآن کو مورچے پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی آیات کے لشکروں کو کمیونزم کے خلاف لڑائے؟ —— اگر کسی کا منصوبۂ جنگ یہی ہے تو وہ کمیونزم کو خود کامیابی کے راستے بنا کر دینا چاہتا ہے۔

اب ہم سے پوچھیے کہ ان تینوں تدبیروں کو اگر ہم ناکام قرار دیتے ہیں تو کوئی چوتھی تدبیر ہمارے پاس کیا ہے؟ کمیونزم کو شکست دینے کے لیے ایک نتیجہ خیز منصوبہ بنانے بیٹھیے تو سب سے پہلے اس حقیقت پر غور

لیجیے کہ وہ کیسی فضا ہوتی ہے جس میں کمیونزم پھل پھول سکتا ہے۔ کیسی مٹی میں اس کی جڑ لگتی ہے۔ کیسے سماجی حالات کا موسم ہے جو پنپنے کے لیے اسے سازگار لگتا ہے۔

کمیونزم کی فصل صرف معاشی بے اطمینانی کی زمین میں برگ و بار لاسکتی ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے مفاسد کا ایک تند و تیز ردعمل ہے۔ یہ معاشی مظالم کے خلاف ایک انتقامی تحریک ہے۔ جہاں معاشی نظام مظالم اور مفاسد کی وجہ سے عوام میں بے اطمینانی کا مواد پیدا کرتا ہے وہاں کمیونزم کے جراثیم پلتے ہیں اور جہاں یہ مواد ہی موجود نہ ہو وہاں کمیونزم کے لیے کوئی چانس نہیں ہوسکتا لیکن اگر کہیں یہ زہریلا مواد موجود ہو، وہاں معاشرے کے جسم پر باہر سے کتنے ہی اپریشن کر ڈالیے، سُرخ جرثوموں کا قلع قمع نہیں ہوسکتا اور ان کی افزائش کو نہیں روکا جاسکتا۔

کمیونزم کے لیے بہترین آب و ہوا سیکولرازم کی آب و ہوا ہے۔ جب تک کسی معاشرتی ماحول میں خدا پرستی، مذہب سے وابستگی اور اخلاقی قدروں کا کوئی احترام باقی رہتا ہے، کمیونزم کے پودوں کی بڑھوتری اچھی طرح نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ معاشی نظام کا تختہ الٹنے کے لیے جہاں یہ فتنۂ دورِ حاضر کام شروع کرتا ہے وہاں وہ خدا اور مذہب اور اخلاق کے خلاف اوّلیں مرحلے میں تفلسف، تضحیک اور شر و ادب کے ذریعے ہلّہ بولتا ہے۔

کمیونزم کے لیے موسم بہار ایسی سیاسی صورت حالات سے پیدا ہوتا ہے جس کے اندر حکمران طبقوں اور عوام کے درمیان بُعد کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہو رہی ہو۔

یہ تینوں اسباب اگر یکجا ہو جائیں تو کمیونزم کے فروغ کو کوئی جابرانہ کارروائی نہیں روک سکتی۔

پس ناگزیر ہے کہ پاکستان میں کمیونزم کے لیے ان سازگار اسباب میں سے کوئی بھی باقی نہ رہنے دیا جائے، اگر واقعی خلوص کے ساتھ ہمیں اس سرزمین کو سرخ خطرے سے بچانا ہے۔ ایک طرف معاشی تعمیر و ترقی کا کام تیز رفتاری سے کیا جائے تاکہ قومی دولت کی رفتارِ پیدائش میں اضافہ ہو، عام لوگوں کو کام ملے سب کی ضروریات پوری ہوں اور معیارِ زندگی بلند ہوتا چلا جائے۔ دوسری طرف موجودہ معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے، ان ناہمواریوں کے وجوہ و اسباب کی جڑیں کھودنے، اور معاشی مظالم کا سدِ باب کرنے کے لیے

اسلامی اصولِ معیشت کی بنیاد پر تعمیر کا ایک منصوبہ بنایا جائے۔ پھر یہ ضروری ہے کہ ملک میں خدا پرستی اور مذہب اور اخلاق کی طاقت کو مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے اور سیکولرازم کی فضا باقی نہ رکھی جائے۔ پاکستان کا خمیر چونکہ مذہبی جذبات سے اٹھا تھا اس لیے یہاں کی فضا میں مذہب کا اثر تو کسی دوسرے ملک کے مقابلہ میں زیادہ گہرا پڑا ہے، اور اس ناقص حالت نے بھی کمیونزم کو سات برس میں زور نہیں پکڑنے دیا۔ اب اگر اسلامی اصولوں کو نظامِ اجتماعی کی بنیاد کے طور پر خلوص سے اختیار کر لیا جائے تو پاکستان کی آب و ہوا اس ملحدانہ تحریک کو کبھی راس نہ آئے گی۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے سیاسی کارپرداز رائے عام سے مسلسل انحراف دکھانے، جمہور کے مطالبات کو دبانے اور بات بات پر تشدد کے اسالیب اختیار کرنے کی روش چھوڑ کر اپنے آپ کو عوام کے دلوں کے قریب تر کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح وہ خلیج پاٹ دی جانی چاہیے جو حکمرانوں اور عوام کے درمیان موجود ہے اور جسے ہمارے اکابر خود اپنے ہاتھوں رات دن کھود کھود کر وسیع تر کر رہے ہیں۔ ان تین تدبیروں کے ذریعے کمیونزم کو حالتِ نزع میں مبتلا کیا جا سکتا ہے۔

حفظِ ماتقدم کی ان تدابیر کے علاوہ، اصولاً ایک اجتماعی تحریک کو روکنے کے لیے ایک مثبت اجتماعی تحریک ہی صحیح ذریعہ ہو سکتی ہے۔ سیلاب کو ایک دوسرے جوابی سیلاب ہی سے روکا جا سکتا ہے۔ اجتماعی تحریکیں محض ایک سیاسی پارٹی کی شکل میں کام نہیں کرتیں بلکہ وہ زندگی کے میدان میں ہر چہار جانب سے یورش کرتی ہوئی داخل ہوتی ہیں۔ کمیونزم ہمارے ہاں صرف کمیونسٹ پارٹی کی صورت ہی میں تاخت نہیں کر رہا، وہ ایک طرف سے فلسفہ و فکر کی دنیا پر حملہ بول رہا ہے، دوسری طرف سے وہ عمرانی علوم کے میدان میں تگ و تاز دکھا رہا ہے، تیسری طرف وہ ادب اور لٹریچر کے چور دروازوں سے شبخون مارتا ہے، چوتھی طرف وہ صنعتی مزدوروں کو منظم کر کے آگے بڑھا رہا ہے، پانچویں جانب وہ کسانوں کو اکسا اکسا کر مورچوں پر بھیج رہا ہے۔ ایسی ہمہ گیر تحریک کے محض سیاسی دستے کے آگے اگر آپ نے سخت گیرانہ قوانین کی سنگینیں تان دیں یا امریکی ڈالروں کے بند باندھ دیئے تو اس سے تحریک کی ہر جہتی یورشیں تو رک نہیں سکتیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کی نشستیں نہ جیت سکے گی، لیکن ہمارے نوجوانوں اور ہمارے معاشی مظلوموں کے دل و دماغ کو اس کی تاخت سے کیسے محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

اس کا توڑ ایک برابر کی فکر کی ہمہ گیر اور مثبت تحریک ہی سے ہو سکتا ہے۔ ایک ایسی تحریک جو کمیونزم کے نظریے کے جواب میں نظریہ لا سکے۔ فکر کے جواب میں فکر دے سکے، سیاسی فلسفے کے جواب میں زیادہ بہتر سیاسی فلسفہ رکھ سکے۔ معاشی اصلاح کے منصوبے کے سامنے زیادہ مؤثر منصوبہ پیش کر سکے، اور پھر سیاست کے میدان میں منہ توڑ جواب دے سکے۔ وہ پروپگنڈے کو پروپگنڈے سے توڑے، ادب کو ادب سے شکست دے اور تنظیمی کام کو تنظیمی کام سے ہرا سکے۔ وہ ذہین طبقوں میں آکر بھی اس کا مقابلہ کرے، طلباء میں بھی اس کے دو بدو کھڑی ہو، مزدوروں اور کسانوں کے حلقے میں آکر اس سے ٹکرلے۔ وہ دلیل کا توڑ دلیل سے کر سکتی ہو، وہ جذبات کے مقابلے میں جذبات لا سکتی ہو، شعور کی مدافعت کے لیے شعور کو پیش کرے اور رائے عام کے میدان میں بھی لوگوں کی بڑی اکثریت کو اپنے گرد سمیٹ کر اپنی حریف تحریک کو بالکل مشکلیں کس لے۔

یہی وہ اسکیم ہے جس پر جماعت اسلامی تسلسل سے کام کر رہی ہے۔ اس کام کا مختصر اور محدود سا تجربہ گواہ ہے کہ ٹھیک یہی اسکیم ہے جو اس معاملے میں کوئی مؤثر پارٹ ادا کر سکتی ہے اور جس سے ٹھوس نتائج نکل سکتے ہیں۔ ہم نے پاکستان بننے کے بعد سے پاکستان کے عوام کو اسلامی نظریہ و نصب العین دینے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے قوم کے سامنے کمیونسٹوں کے فلسفے اور نظریے کے جواب میں اسلام کا فلسفہ و نظریہ پیش کیا ہے اور اکثریت کو اپنے ساتھ لیا ہے۔ ہم نے سیاسی کشمکش کے میدان میں کمیونزم کے دلائل کا اثر اپنے دلائل کے زور سے باطل کیا ہے ہم نے طلبہ میں کام کر کے ایک بڑی تعداد کو نہ صرف کمیونزم کی زد سے بچا نکالا ہے بلکہ ان کو ذہنی اور عملی پہلوؤں سے کمیونزم کے خلاف ہر جہت سے لڑائی لڑنے کے قابل بنا دیا ہے۔ ہم نے مزدوروں اور کسانوں میں جو تھوڑا بہت کام اب تک کیا ہے اس کی وجہ سے اب ان طبقوں میں کوئی حرکت کمیونسٹوں کی رہنمائی میں بپا ہونی مشکل ہو گئی ہے۔ ادب کے میدان میں کمیونسٹوں کی تخلیقات کا رعب ہمارے ادیبوں کے کام نے ختم کر دیا ہے۔ ان کے انقلابی خیالات کی رَو آگے بڑھتے بڑھتے ختم ہو گئی ہے، ان کے ادبی حلقوں کی رونق اڑ گئی ہے اور ان کے جرائد اور ان کی مطبوعات کا حلقہ فروخت سکڑ گیا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد جن حالات نے اس ملک میں کمیونسٹوں کو آگے بڑھنے

سے روکے رکھا ہے ان میں سے سب سے زیادہ حصّہ نہ سہی، ایک بڑا حصہ جماعت اسلامی کی برپا کردہ اسلامی تحریک کا ہے۔

اسلامی تحریک یہ جو کچھ کر پائی ہے، وہ اس کے علی الرغم ہے کہ اس تحریک کے خلاف پروپگنڈہ کرنے، اسے دبانے اور نقصان پہنچانے، اس کی آواز کو کمزور کرنے، اس کے حلقۂ اثر کو محدود کرنے اور اسکی پیشقدمی کو روکنے کے لیے جو جو تدابیر بھی مسلم لیگی حکومتوں کے بس میں تھیں، انہوں نے پوری طرح استعمال کی ہیں۔ اس تحریک کو کمیونزم کے خلاف کوئی مدد بہم پہنچانا تو کجا، اُلٹا اس کے ہاتھ ہمیشہ کمزور کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مدد نہ سہی، اگر کم سے کم ہمیں جھوٹے پروپگنڈے، مخالفت کی سازشی تدبیروں اور تشدد کی تحت تنی کارروائیوں ہی سے امان ملی ہوتی تو ہمارا اندازہ یہ ہے کہ اب تک پاکستان میں کمیونزم کی جڑیں بیشتر کٹ گئی ہوتیں اور شاید مشرقی پاکستان میں ایسی بے ہنگم تبدیلی نمودار نہ ہو سکتی جس سے آج حکومت اور ملک کو سابقہ درپیش ہے۔

ایک نظریہ رکھنے والی اجتماعی تحریک سے ملک کے عوام کو لڑانے کے لیے ضروری ہے کہ ان کو مساویانہ طاقت کی نظریہ رکھنے والی اجتماعی تحریک سے مالامال کیا جائے۔ انہیں نصب العین دیا جائے، ان میں مقصدیت کی روح بیدار کی جائے، ان میں ایک ایمان تازہ اُبھارا جائے، ان کے سینوں کو نورِ خودی سے منور کیا جائے۔ ان کی رگوں کے خون کو گرم کرنے والے محرکات فراہم کیے جائیں، ان کے اندر سے جذبات کا ایک نیا سیلاب بہا دیا جائے، ان کو سیرت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ کیا جائے، ان میں اپنے نظریہ کی کامیابی اور اپنے نصب العین کی فتح کی امنگیں جگا دی جائیں، مختصر یہ کہ پوری قوم کو تخلیقِ نو کے عمل سے گذارا جائے اور انسانیت کا ایک نیا نمونہ اٹھ کھڑا کیا جائے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ یہ محنت طلب حکیمانہ کام مسلم لیگ کے بس کا روگ نہیں۔ وہ خود ہی نظریہ و نصب العین کے لحاظ سے قلاش ہے تو دوسروں پر کیا عنایت کرے گی۔ وہ مقصدیت کہاں سے لائے گی۔ وہ زندگی کو نئے محرکات و جذبات کہاں سے فراہم کرے گی۔ وہ سیرت و اخلاق کا جوہر کدھر سے بہم پہنچائے گی اور وہ قوم کی تخلیقِ نو کا سروسامان کیسے کر سکے گی! اس سے زیادہ بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ یہ تنظیم جس اونچے طبقے کی کٹھ پتلی بن کر

رہ گئی ہے وہ جہاں خود کام کا کوئی مناسب نقشہ نہیں سوچ سکتا، وہاں وہ کسی دوسرے کے مشورے سے استفادہ کرنے پر بھی تیار نہیں ہے۔ بلکہ اُلٹا وہ اُن لوگوں کو بھی کام کرنے کا موقع دینے میں حد درجہ بخیل واقع ہوا ہے جو کسی صحیح کام کا نقشہ سوچ بھی سکتے ہیں اور اس کے عملی فرائض بھی انجام دے سکتے ہیں۔ پھر یہ طبقہ دراصل اسلامی تحریک کو لے کر چلنے والوں کے خلاف مختلف زیادتیاں کر کرکے ہی کمیونزم کے ہاتھ مضبوط نہیں کر رہا بلکہ اسلام کا نام برعکس قسم کے اعمال اور کارروائیوں اور سرگرمیوں کے ساتھ استعمال کر کے روسی ترکستان کی سی صورت پیدا کرنے میں حصہ ادا کر رہا ہے۔ اسلام کے یہ کرم فرما ایک طرف اسلام کے نعرے لگاتے رہے اور دوسری طرف اسلامی دستور کے مطالبے کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور بھی صرف کرتے رہے۔ پھر ایک طرف مسودۂ دستور میں کتاب و سنت کے اصولوں کو رہنما مانا، دوسری طرف موجودہ سرمایہ داری اور اقتصادی نظام کو اسلام کے دائرۂ عمل سے ہمیشہ کے لیے باہر نکال لے گئے۔ ایک طرف اسلامی معاشرہ تعمیر کرنے کا پیمان باندھا، دوسری طرف آرٹ اور کلچر کی ایسی دلچسپیوں میں جا ڈوبے جن کی کوئی جگہ اسلامی فریم میں نہیں نکل سکتی۔ ایک طرف طے کیا کہ یہ جمہوریۂ اسلامیہ ہے، دوسری طرف مصطفیٰ کمال بننے اور "ملّا ازم" اور "مذہبی جنونیوں" کے خلاف معرکہ آرائی کے ارادے پیش کیے

ہم عرض کریں گے کہ جس چیز کو آپ ملّا ازم اور مذہبی دیوانگی کا نام دے دے کر مٹانے پر تلے ہوئے ہیں، اسے مٹانے کے بعد آپ افراد کے دل و دماغ اور معاشرے کی روح میں وہ خلا پیدا کر دیں گے جسے کمیونزم کے سوا اور کوئی چیز پُر ہی نہیں کر سکتی۔ آپ کسی سخت سے سخت ڈکٹیٹر شپ کے زور سے بھی اس خلا کو دو چار سال سے زیادہ عرصہ تک برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اس کی فطرت تقاضا کرتی ہے کہ اسے بھرا جائے۔ اسے اگر آپ اسلامی نظریہ و نصب العین سے کسی کو نہیں بھرنے دیں گے تو اس خانۂ خالی کو کمیونزم کا دیو ضرور تصرف میں لے گا۔ آج نہیں تو کل!

پس ذہنوں کو ذرا چند سال آگے تک سوچنے کے موڈ میں لائیے اور پھر ٹھنڈے دل سے سوچیے، کہ کمیونزم اور اسلام دونوں سے آپ کو لڑنا ہے، یا دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے؟ انتخاب کرنا ہے تو وہ پسند ہے یا یہ؟

مطالبۂ نفاذِ شریعت

(الامام حسن البنّاء مرحوم)

[یہ مضمون دراصل ایک طویل مکتوب کا ترجمہ ہے جو استاذ حسن البناء شہید رحمۃ اللہ علیہ نے آج سے تقریباً سترہ سال قبل مصر کے وزیر قانون کے نام تحریر کیا تھا۔ جو لوگ سرزمین پاکستان میں اسلامی دستور اور شرعی قانون کا مطالبہ کر رہے یا اس مطالبے سے ہمدردی رکھتے ہیں وہ اس مراسلے کو بالکل آپ بیتی محسوس کریں گے، حتیٰ کہ اس میں دو چار جگہ جہاں "مصر" کا لفظ آیا ہے، اسے اگر پاکستان کے لفظ سے بدل دیا جائے تو یہ تصور کرنا بھی محال ہو جاتا ہے کہ یہ داستان پاکستان سے نہیں بلکہ مصر سے متعلق ہے۔ مصر میں جس کشت عمل کو امام شہیدؒ نے اپنے خون سے سینچا تھا وہ بحمد اللہ بار آور ہو رہی ہے۔ حالیہ اطلاع ہے کہ فوجی حکومت انفرادی رہائیوں کے بعد اب اخوان پر سے جماعتی پابندیاں بھی اٹھا دینے پر مجبور ہو چکی ہے۔ اللہ نے چاہا تو پاکستان میں بھی دار و رسن اور قید و بند تحریک اسلامی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکیں گے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔]

ہم اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ ہماری قوم کی نجات اسی میں ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر گوشے میں اسلام کی تعلیمات و ہدایات کا اتباع کرے۔ اس کے حق میں بے شمار دلائل موجود ہیں۔ آپ کے سامنے ان دلائل کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ الحمد للہ آپ اس نظریے کے خود بھی قائل ہیں۔ اسلامی تعلیمات کا اولین و اہم ترین شعبہ قانون ہے۔ اس وقت ہم اور آپ میدان عمل میں ہیں اور ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ ہم حقائق کا سامنا کریں۔ اس وقت وزارتِ قانون کا قلمدان آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ اس بات کی قدرت رکھتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کی ان تمناؤں اور آرزوؤں کو بار آور کریں جن کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے پر آمادہ ہیں۔ مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ مصر کے قانون اور عدالتی نظام کو شریعت اسلام کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ چونکہ آپ بھی ایک دائرے میں رعیت کے راعی ہیں، اس لیے اس سلسلے

میں آپ خدا و خلق کے سامنے مسئول اور جواب دہ ہیں۔

اس قوم کے افراد جب یہ دیکھتے ہیں کہ اس ملک میں اللہ کے قانون کے خلاف فیصلے کیسے جاتے ہیں تو وہ اپنے دلوں میں سخت تنگی اور انقباض محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح کے حالات میں صبر کا پیمانہ لبریز ہو جانے کے بعد چھلک جاتا ہے اور اندر ہی اندر جو مادہ پک رہا ہوتا ہے وہ بسا اوقات پھوٹ نکلتا ہے۔ سب سے زیادہ خطرناک تصادم کی صورت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ ایک قوم کا ذہن حق کے اصول اور باطل کے نظریات کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ ہمارے موجودہ ملکی قوانین اور اسلام کے قوانین ایک دوسرے کی ضد ہیں اور دونوں جابجا ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ابنائے قوم کے دل و دماغ میں ایک اضطراب اور بے چینی رونما ہو رہی ہے اور وہ اس تضاد کو بُری طرح محسوس کر رہے ہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آپ مسلمانوں کو قوانین کی بے احترامی اور خلاف ورزی پر مجبور نہ کریں اور حالات کو بدلنے کی کوشش کریں۔ آیئے ہم اللہ کے حضور میں حاضر ہوں اور اس بارے میں اُس کے ارشادات کو سُنیں۔ کیا یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان نہیں ہے ؟ :-

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (النساء: ۶۵)

پس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ نہیں ایمان لا سکتے جب تک کہ وہ تجھے حکم نہ بنالیں اپنے متنازعہ فیہ معاملات میں، پھر وہ اپنے دلوں میں تنگی بھی نہ محسوس کریں تیرے فیصلے پر اور سرِ تسلیم خم نہ کر دیں۔

وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ فَإِن تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَن يُصِيبَهُم بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ۔ أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ

اور یہ کہ تم فیصلہ کرو اُن کے مابین اُس کے مطابق جسے اللہ نے اتارا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور ان سے چوکنے رہو مبادا وہ تمہیں بہکا دیں تم پر اللہ کے نازل کردہ بعض احکام سے۔ اگر وہ منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ انہیں ان کے بعض گناہوں پر عذاب دینا چاہتا ہے۔ اور یقیناً لوگوں میں سے بہت سے

يُوْقِنُوْنَ — فاسق ہیں۔ کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؛ اور کون ہے بہتر اللہ سے فیصلے میں یقین رکھنے والوں کے لیے۔ (المائدہ: ۴۹-۵۰)

مذکورہ بالا آیات المائدہ کے جس رکوع سے لی گئی ہیں وہ سارا اسی موضوع پر ہے۔ اس کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ وہی ظالم ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہی فاسق ہیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۚ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا۔ (النساء: ۱۰۵)

ہم نے نازل کی ہے تم پر کتاب حق کے ساتھ تاکہ تم فیصلہ کرو لوگوں کے درمیان اس کے مطابق جو تمہیں اللہ نے دکھایا ہے اور خائنوں کے طرفدار نہ بنو۔

یہ تو ہیں کلی اور عمومی احکام۔ لیکن ان کے علاوہ قرآن میں بہت سے تمدنی، تجارتی، تو ہین الملی اور اسی قبیل کے دوسرے احکام ہیں جو جزئیات سے متعلق ہیں اور ان کی مزید تفصیل و تائید احادیث صحیحہ میں ملتی ہے۔ ان تمام احکام کی غرض یہی ہے کہ مسلمان ان پر عمل پیرا ہوں اور اپنے تنازعوں کا فیصلہ ان کے مطابق کریں۔ اب اگر آپ اپنے ملک کے دستور اور قانون پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ ان کا ماخذ اور سرچشمہ کتاب و سنت نہیں بلکہ یورپ کے ممالک ۔ ۔ (بلجیم، فرانس، اٹلی وغیرہ) کے دساتیر و قوانین ہیں۔ ہمارا دستور و قانون کلیات کے اعتبار سے بھی اور جزئیات کے لحاظ سے بھی اسلام سے صریح طور پر متصادم اور متناقض ہے۔ اب غور کیجیے کہ اگر ایک مسلمان کے سامنے ایسا معاملہ آتا ہے جس کا فیصلہ اسلام کی رو سے کچھ اور ہے، اور موجودہ قانون کی رو سے کچھ اور، تو اس وقت وہ مسلمان کونسا موقف اختیار کرے گا۔ پھر غور کیجیے کہ اس ملک کے مجسٹریٹ، جج، چیف جسٹس اور وزیر عدالت کے لیے احکم الحاکمین کے احکام کی مخالفت کیسے جائز اور حلال ہو گی۔

میں آپ سے پرزور درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس تضاد و تناقض کو دور کریں، ہمیں اس بلا سے نجات بخشیں اور اعمال اور عقائد کے اس ٹکراؤ کو ختم کریں۔ یہ چیز میرے علم میں ہے کہ بکثرت مسلمان اپنے جائز جانی و مالی حقوق سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور بہت سے نقصانات کو

محض اس لیے گوارا کر لیتے ہیں کہ وہ ایسی عدالت اور ایسے قاضی کے سامنے جانا حرام سمجھتے ہیں جو خلافِ شریعت فیصلے صادر کرے۔ اس صورتِ حال کے نتائج بڑے خوفناک ہیں اور اللہ اپنے محاسبے میں بڑا سخت گیر ہے۔ میرا یہ فرض ہے کہ آپ کو توجہ دلاؤں اور یاد دہانی کروں۔ اللہ کے سامنے عذرات کچھ کام نہیں آئیں گے۔ اللہ کی نظر اعمال پر بھی ہے اور نیتوں پر بھی۔

یہ تو اس معاملے کا باطنی پہلو ہے جس کا تعلق ہمارے ایمان اور عقیدے سے ہے۔ لیکن اگر قانون کے خالص ظاہری نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تب بھی ملکی و غیر ملکی، مسلم و غیر مسلم دونوں قسم کے ماہرینِ قانون نے اعتراف کیا ہے کہ شریعتِ اسلامیہ قانون سازی کا ایک نہایت شاداب، جامع، اور بیش قیمت ذخیرہ ہے۔ فرانس کے متعدد قانون دانوں نے اپنی قوم کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے قوانین میں شریعتِ اسلامیہ کے مطابق ترمیم کریں اور کئی بین الاقوامی اجتماعات میں مقننین نے قوانینِ اسلامی کی تعریف کی ہے اور تسلیم کیا ہے کہ شریعت کی تعلیمات قانون سازی کے بارے میں پورے طور پر کفایت کرتی ہیں۔ یورپ کے غیر اسلامی قوانین کو ہم مصر میں پچاس سال سے زائد عرصے تک برت کر دیکھ چکے ہیں۔ ان کا حاصل جرائم کی کثرت اور روز افزوں اضافے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ سنگین اور ہولناک وارداتیں چاروں طرف رونما ہو رہی ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ موجودہ قوانین ہمارے امراض کا مداوا نہیں ہیں اور ہمارے ماحول اور قومی مزاج سے انہیں قطعاً کوئی مناسبت نہیں ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے جن ممالک میں چند ایک قوانینِ شرعیہ نافذ ہیں وہاں ملک کے امن و اخلاق پر ان کے اچھے نتائج مترتب ہو رہے ہیں۔ کیا سرزمینِ مصر کو اس کا موقع نہیں دیا جائے گا کہ وہ بھی قوانینِ اسلامی کی برکات سے مستفید ہو؟

یہ مسئلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل صاف اور واضح ہے تاہم کچھ لوگ ہیں جو نیک نیتی یا بدنیتی کی بنا پر اس اصلاح کے رستے میں حائل ہیں۔ ان کی طرف سے عموماً چند شبہات پیش کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے پہلا شبہ یہ ہے کہ مصر میں کچھ غیر مسلم اقلیتیں ہیں۔ اگر یہاں اسلامی احکام نافذ کر دیے جائیں تو اس سے اس مذہبی آزادی میں مداخلت واقع ہو گی جس کی دستوری طور پر ضمانت دی جا چکی ہے

اور اگر غیر مسلموں کو ان احکام سے مستثنیٰ قرار دیا جائے تو یہ حقوق شہریت میں ایک ناپسندیدہ امتیاز ہوگا جس سے بحمداللہ ہم چھٹکارا حاصل کر چکے ہیں۔ اس شبہ کے دونوں اجزا باطل ہیں۔ اگر ملک میں اسلامی احکام نافذ کیے جائیں تو اس سے مذہبی آزادی پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ دستور میں اقلیتوں کو جس چیز کی ضمانت دی جاتی ہے وہ عقیدہ، عبادت، شعائر اور احوال شخصیہ کی آزادی ہے۔ قانون ملکی بہرحال اکثریت کی مرضی کا آئینہ دار اور اس کے نظریات کا مظہر ہوتا ہے قطع نظر اس سے کہ قانون کا مصدر کیا ہے۔ جس قانون پر جمہور متفق ہو جائیں وہی ملک میں رائج ہوتا ہے اور اس بارے میں اقلیت کو اکثریت کی بات ماننے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اقوام یورپ اس بات پر فخر کا اظہار کرتی ہیں کہ وہ حریت اور شخصی حقوق کا بہت احترام کرتی ہیں اور جمہوریت کی علمبردار ہیں۔ لیکن وہ بھی اپنی اقلیتوں کے ادیان و عقائد کا لحاظ کیے بغیر اپنی منشا کے مطابق قوانین وضع کرتی ہیں۔ فرانس، انگلستان، جرمنی وغیرہ میں ایک فرد خواہ کتنا امین ہو، خواہ اس کا تعلق ایسی اقلیت سے ہو جس کا دین اکثریت کے دین سے مختلف ہے، وہ ملک کے قانون کی پابندی کرتا ہے۔ اس کے بغیر جمہور کی آزادی اور داخلی و خارجی استقلال متحقق ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر غیر مسلم اپنے شخصی معاملات میں فیصلے اپنے پرسنل لا کے مطابق کریں اور بقیہ معاملات میں قانون موضوعہ پر عمل کریں تو اس سے کوئی ایسا امتیاز نہیں پیدا ہوتا جو کسی خدشے یا اعتراض کا موجب ہو سکے۔ ہم کسی غیر مسلم کو اس امر پر مجبور نہیں کرتے کہ وہ اپنے پرسنل لا کی پابندی کرے بلکہ ہم اس کا انتظام اس کی اپنی خواہش اور مرضی کی بنا پر کرتے ہیں۔ اس سے مقصود کوئی ناروا پابندی یا حق تلفی نہیں ہے۔ دوسری طرف اگر ہم ملکی قانون کو اقلیت کے مسلک اور نظریے کے مطابق بنائیں تو یہ اکثریت کے حقوق پر ایک شدید ظلم اور زیادتی کے مترادف ہوگا۔ پھر آپ کو معلوم ہوگا کہ بہت سے مسیحی برادران وطن نے بھی یہ مطالبہ کیا ہے کہ بلا امتیاز تمام معاملات میں احکام شرعیہ کو ان پر بھی نافذ کیا جائے اور اس بارے میں حق بات اللہ تبارک و تعالیٰ نے ارشاد فرمائی ہے کہ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا (پس تم مت ڈرو لوگوں سے بلکہ ڈرو مجھ سے اور مت لو میری آیات کے عوض حقیر قیمت)

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلامی قوانین کا اجرا عملاً ناممکن ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ہم سود کا

ابطال کیسے کر سکتے ہیں، جبکہ ہم بین الاقوامی اقتصادی نظام کی جکڑ بندیوں میں بندھے ہوئے ہیں لیکن یہ اعتراض بھی بالکل بے اصل ہے کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بعض قوی العزائم قوموں نے اپنے لیے مخصوص اور منفرد معاشی نظام وضع کیے ہیں اور ساری دنیا کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ ان کا احترام کریں۔ اس معاملے میں فیصلہ کن شئے حکومت کی قوت ارادی اور قوم کی عملی استعداد ہے۔ اس بارے میں جو چیز ہماری راہ میں رکاوٹ ہے وہ صرف عزم کی کمزوری اور موہوم خطرات کا بیجا خوف ہے۔ ہماری قوم اللہ کے فضل سے ہر مشکل کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ ہم زندگی کی بیشتر ناگزیر ضروریات خود پیدا کر سکتے ہیں اور اس بارے میں ہمیں اغیار کا دست نگر بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہمارے ارادے مضبوط ہو جائیں تو ہم اقوام عالم کے علی الرغم اپنے مالی نظام کو تیار رکھ سکتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ اٹلی پر ایک وقت ایسا آیا ہے جبکہ اس پر چاروں طرف سے باون اقوام نے یورش کر دی تھی اور ان میں دنیا کی عظیم ترین سلطنتیں بھی شامل تھیں۔ انہوں نے مل کر اٹلی پر تاوان عائد کیے تھے لیکن آخر کار اٹلی کی عزیمت کے سامنے ان سب کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور قومی غیرت کے سامنے بندوقوں اور تلواروں کی کچھ پیش نہ گئی۔ اسی طرح آپ کو معلوم ہے کہ ہٹلر نے یہ فرمان صادر کر دیا تھا کہ جرمنی کا سونا اور سکہ جرمنی سے باہر نہیں جائے گا۔ کیا اس سے دوسرے ممالک کے ساتھ جرمنی کا لین دین ختم ہو گیا تھا؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ دوسری قوموں نے اس فیصلے کا احترام کیا، اور مبادلے کے اصولوں پر جرمنی سے معاملہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ دونوں قومیں طاقتور تھیں اور ہم کمزور ہیں۔ اس طرح کے معاملات میں فوج کشی اور لشکر آرائی تک نوبت شاذونادر ہی پہنچتی ہے۔ یہ خرید و فروخت اور لین دین کے مسائل ہیں۔ کوئی قوم خواہ کتنی ہی ضعیف کیوں نہ ہو وہ اس خصوص میں بالکل آزاد ہے بشرطیکہ وہ یکسو ہو کر اپنے مطمح نظر کو واضح کر دے اور پھر ثابت قدمی کے ساتھ اپنے موقف پر جم جائے۔

دوسری قومیں تو صرف یہ چاہتی ہیں کہ ہم اُن کے ساتھ شریف آدمیوں کا سا معاملہ کریں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ قرض کا کاروبار کرنے والے بہت سے بنک، اور دوسرے ادارے برابر کے لین دین پر رضامند ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ادائیگی یقینی ہو جائے۔ اس لیے اگر ایک طرف اگر ہم سود کو قانوناً ممنوع قرار دے دیں اور دوسری طرف واجبات کی پوری پوری ادائیگی کا شدت سے اہتمام کریں تو دوسری حکومتیں اس پر راضی ہو جائیں گی

اور ادائے حقوق کی ضمانت کے بعد وہ سودی لین دین پر اصرار نہیں کریں گی، خصوصاً جبکہ انہیں بتایا جائے گا کہ سود تمام مذاہبِ عالم کے نزدیک حرام ہے۔ آخر کیوں نہ مصر کو اس شرف میں سبقت حاصل ہو کہ وہ دنیا کو سود کی لعنت اور خباثت سے نجات دلانے کی جدوجہد کرے اور کیوں نہ مصری حکومت نوعِ انسانی کے لیے اس نویدِ رحمت کی پیامبر ثابت ہو۔ ایک زمانہ تھا کہ یورپ کی قومیں بردہ فروشی کو اپنی تہذیب و معاشرت کے لیے بالکل اسی طرح ضروری سمجھتی تھیں جس طرح آج وہ سود کو سمجھتی ہیں۔ انہی میں سے بعض نے اس کاروبار کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا اور آخر کار دوسری قوموں نے بھی اس کی نامعقولیت کو تسلیم کر کے اسے ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا۔ کل اگر بردہ فروشی کے خلاف علم بلند کیا جا سکتا تھا تو آج کیا سود کے خلاف جہاد نہیں کیا جا سکتا؟ اس بارے میں آخر خوف و یاس ہمیں کیوں لاحق ہو؟ کیا آج ہم انسانیت کی خدمت سے بالکل عاجز ہو چکے ہیں؟ حالانکہ کل تمام دنیا میں علم و عرفان کی روشنی پھیلانے والے ہم ہی تھے۔ یہ محض شاعری یا خیال آرائی نہیں ہے بلکہ یہ حقائق ہیں جنہیں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اگر ہم سود کو ترک کر دیں تو یہ امر ہماری اقتصادی خود مختاری کا باعث ہوگا اور ہماری قوم جو اغیار کے سہاروں پر جینے کی عادی ہو چکی ہے، اس میں خود اعتمادی، عزتِ نفس اور دوسروں سے بے نیازی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس سے زیادہ موزوں اور قیمتی موقع آخر کونسا ہوگا۔ ہماری قوم ایک دینی مزاج رکھتی ہے اور اسے متحرک اور آمادۂ عمل کرنے کے لیے دینی عوامل سب سے زیادہ کارگر ہو سکتے ہیں۔ سود کی تحریم سے ایک فائدہ یہ بھی حاصل ہوگا کہ ہماری غریب قوم قسی القلب سود خوار لٹیروں اور قزاقوں سے گلو خلاصی حاصل کرے گی۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اگر قوانینِ شرعیہ کا نفاذ عمل میں لایا گیا تو چوروں کے ہاتھ کٹنے شروع ہو جائیں گے اور زانیوں کو سنگسار کیا جایا کرے گا، ہماری قوم دورِ وحشت کی طرف لوٹ جائے گی، تہذیب و ترقی کی رفتار یک لخت تھم جائے گی اور ہمارا شمار غیر متمدن قوموں میں ہونے لگے گا۔ یہ اعتراض بھی بالکل بے حقیقت ہے اور دراصل یہ ایسے افراد کے ذہن کی پیداوار ہے جو نظمِ اجتماعی کو درہم برہم کرنے کے درپے ہیں، زندگی کے ہر گوشے میں مطلق اباحیت اور بے قیدی کے خواہش مند ہیں، دوسروں کی جان و مال اور عزت و ناموس پر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں اور اس اندیشے نے ان کی نیند حرام کر رکھی ہے کہ کہیں اسلام کی قربان گاہ پر سب سے پہلے

زد میں جینیاٹ نہ چڑھا دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ جرائم کی کثرت کو تہذیب و ارتقاء کی علامت قرار دے دینا صحیح ہے اور نہ اس قانون کو رجعت پسندانہ اور سنگدلانہ سمجھ لینا درست ہے جو جرائم و فواحش کا استیصال کرے۔ ایسا قانون تو تہذیب و ترقی کا عین مظہر ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ان فاسد افکار و نظریات کو ختم کیا جائے۔ مصلحین اسلام کے لیے یہ موقع شرمانے کا نہیں بلکہ آگے بڑھ کر کام کرنے کا ہے۔ آج کل نظریات بدلے ہیں کہ قانون کی ہمدردی مجرم کے حق میں زیادہ اور معاشرے کے حق میں کمتر ہو گئی ہے۔ مجرم کے ساتھ سختی کے بجائے نرمی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہولناک جرائم چار سو پھیل چکے ہیں اور پھیل رہے ہیں، قانون ان کے مقابلے میں بالکل عاجز اور بے بس ہے۔ قومی کمائیوں اور محنتوں کا بیشتر حصہ پولیس، قید خانوں اور عدالتوں میں صرف ہو رہا ہے لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا۔ اس وقت فلسفۂ جرم سے متعلق خوشنما بحثوں اور لاطائل استدلالات کی اتنی ضرورت نہیں ہے۔ جتنی ضرورت جرم کے عملی سدِ باب اور روک تھام کی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلامی قوانین کے نافذ کرنے میں ایک عملی مشکل یہ ہے کہ ایسی جامع شخصیتوں کا ملنا محال ہے جو بیک وقت اسلامی علم و عمل سے آراستہ ہوں۔ حاملینِ دین قانون کی تدوین و تنفیذ کے جدید تقاضوں سے بے خبر ہیں اور قانون دان دین کا علم نہیں رکھتے اور جب تک مردانِ کار پیدا نہ ہوں قانونِ اسلامی کو مفید اور مناسب شکل میں کیسے رائج کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ شبہ بھی بے بنیاد ہے اور اس مشکل پر قابو پا لینا بالکل سہل ہے۔ اللہ کے فضل سے ایک طرف ہمارے علماء دین میں بہت سے حضرات ایسے ہیں، جن کی قانونِ جدید پر بھی وسیع نظر ہے۔ اور دوسری طرف ہمارے ہاں قانون کے بہت سے ماہرین ایسے موجود ہیں جنہیں اسلامی فقہ و تشریع سے پورا پورا شغف ہے اور جنہوں نے اس سلسلہ میں بڑی محنت سے اسلامی اور غیر اسلامی قانون کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور اپنی تحقیق کے نتائج ہمارے سامنے پیش کیے ہیں۔

پھر ایک اعتراض ایسا بھی وارد کیا جاتا ہے جو خالص ... نقطۂ نظر اور مصالحِ شخصی ... کہا جاتا ہے کہ شرعی قانون پا اسرار کرنے والے در پردہ "عدالت ہائے شرعیہ"[1] پر قابض ہونا چاہتے ہیں ... کے ...

---

[1] عدالتی نظام دو حصوں میں تقسیم ... عدالتی نظام قانونِ ملکی کی ... کو قسم کے معاملات ... وہیں کو مجاز ہیں۔

یہ ہیں کہ عدالت ہائے اہلیہ میں کام کرنے والوں کی کثیر تعداد کو بالکل بیکار و بے روزگار بنا دیں، یہ چاہتے ہیں کہ ایک خاص گروہ سارے عدالتی مناصب سنبھال لے اور دوسروں کو ان سے بالکل محروم کر دے۔ عدالت ہائے اہلیہ کا نظام بہت وسیع، دقیق اور ہمہ گیر ہے، یہ کس طرح ممکن ہے کہ شرعی عدالتوں کے چند جج ایسی عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ یہ اعتراض بھی بالکل لغو اور پوچ ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ایک خاص قسم کا علم کسی خاص طبقے کی نسلی میراث ہے؟ کیا ہر ذہین آدمی کی رسائی ہر علم و فن تک نہیں ہو سکتی؟ ہمیں اس بارے میں کامل اطمینان ہے کہ دونوں قسم کی عدالتوں کے مجسٹریٹ اور جج صاحبان اگر چند ماہ بھی باہمی تدریس و تربیت پر صرف کریں تو وہ قانون کے سارے شعبوں پر حاوی ہو جائیں گے۔ آدمی جس راہ پر بھی پیش قدمی کرنے کا پختہ ارادہ کر لے، وہ راہ اس کے لیے ہموار ہو جاتی ہے۔ ہم کسی بھی فرد یا گروہ کی بے جا طرفداری یا عداوت میں مبتلا نہیں ہیں۔ ہم تو اس تفریق اور دو عملی کو ہی سرے سے مٹا دینے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم تو یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ اہلی و شرعی امتیازات یک قلم ختم کر دیے جائیں، اور عدالت کا ایک کلی اور وحدانی نظام قائم کیا جائے، اور اس کے لیے اصل بنا اور ماخذ شریعت الٰہی کو قرار دیا جائے۔

یہ چند شبہات ہیں جو ہم نے آپ کے سامنے نمونۃً رکھے ہیں اور ان کے مختصر جوابات بھی دے دیے ہیں۔ اس سے بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قانون شرعیہ کے نفاذ سے متعلق جن شکوک و اعتراضات کا اظہار کیا جاتا ہے وہ کتنے بے اصل اور بے بنیاد ہیں۔ یہی حال ہر اس اعتراض کا ہوتا ہے جس کی پشت پر نفسانی اغراض اور حق سے اعراض کا جذبہ کارفرما ہو۔

الاخوان المسلمون کا مطالبہ یہ ہے کہ ہماری حکومت شریعت اسلامیہ کی طرف لوٹے اور قانون مصری کے نظام کو فوراً شریعت کی بنیادوں پر استوار کرے۔ ہم ایک مسلم قوم ہیں۔ ہم نے عزم کر لیا ہے کہ ہم صرف اللہ کے قانون اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی برتری اور بالادستی تسلیم کریں گے، خواہ ہمیں اس کی بھاری سے بھاری قیمت بھی ادا کرنی پڑے اور بڑی سے بڑی قربانی بھی پیش کرنی پڑے۔ ایک آزاد اور خود مختار مسلمان قوم ہونے کی حیثیت سے یہ ہمارا فطری حق ہے، اور سیاسی و اجتماعی شوکت و استقلال کا کوئی دوسرا مظہر اس کا بدل اور قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ آپ بھی اس حق کے حصول میں ہماری مدد کیجیے، اس صورت حال کو بدلنے کی کوشش کیجیے اور قوم کو مجبور نہ کیجیے کہ وہ کسی ایسے راستے پر پڑ جائے جس پر مایوسی اور اضطرار کی حالت میں قومیں پڑ جایا کرتی ہیں۔

انسانیت کی تعمیرِ نو اور اسلام

عبدالحمید ایم ۔ اے

(۶)

کسی نظامِ حیات کی صحت یا عدمِ صحت کا بالعموم دو طریقوں سے اندازہ کیا جاتا ہے: ایک نظریاتی اور دوسرا عملی۔

نظریاتی اعتبار سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ نظام جن بنیادی افکار پر قائم ہے، اُن میں کہاں تک صداقت ہے، اُن میں کس درجہ کا باہمی ربط و تطابق پایا جاتا ہے اور یہ افکار کس حد تک حقیقت کے سانچوں میں ڈھلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

عملی نقطۂ نظر سے اس امر کو جاننے کی کوشش کی جاتی ہے کہ کوئی نظریہ آشنائے تعبیر ہو کر کس طرح نوعِ انسانی کے لیے مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے۔

پچھلے صفحات میں ہم نے اشتراکی افکار کا ایک سرسری سا جائزہ لے کر یہ بتایا ہے:

- اشتراکیت نے زندگی کی میکانکی توجیہ پیش کر کے انسان کو انسانیت کے درجہ سے گرا دیا ہے۔
- اس نے اپنے سارے فکر کی بنیاد اس مفروضہ پر اٹھائی ہے کہ انسان فطرتاً شرارت پسند ہے۔ اس سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا اس پر جب کبھی بھی اعتماد کیا گیا تو اس نے نقصان ہی پہنچایا۔
- یہ دنیا اور اس کے سارے اسباب و وسائل ایک لاوارث مال ہے جس کا کوئی مالک اور خالق نہیں۔
- انسان اپنے اعمال کے لیے کسی بالاتر ہستی کے سامنے جواب دہ نہیں۔
- مذہب و اخلاق بشر و نشر سب ڈھکوسلے ہیں جن کو سرمایہ داروں نے محض اپنے ناجائز مفادات کی حفاظت کے لیے گھڑ لیا ہے۔
- جائز و ناجائز، "خوب" و "ناخوب" کے معیار سراسر اضافی ہیں جو زمان و مکان کی تبدیلی کے ساتھ ہر آن

بدلتے رہتے ہیں۔

دنیا کے سارے افکار و اعمال کا اصل خالق اُس عہد کا معاشی ماحول ہے۔

• ان بنیادی تصورات پر اشتراکی تحریک کی عظیم الشان عمارت تعمیر کی گئی۔ اور لوگوں کو بتایا گیا کہ دنیا کی ساری برکتیں اسی کو اپنانے سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ جو قوم بھی اسے قبول کرے گی اُسے اس دنیا میں جنت کی نعمتیں حاصل ہونگی۔ خصوصاً:

• اُس کے اندر طبقاتی تقسیم ناپید ہو گی۔

• ملک کا دولتمند طبقہ کسی دوسرے گروہ پر مظالم نہیں ڈھائے گا۔

• "مساوات شکم" کے اصول پر کاربند ہونے سے معاشرتی عدل حاصل ہو گا۔

• اس سوسائٹی کے سارے کام ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سرانجام پائیں گے۔ لہٰذا جو فرد بھی جس شعبۂ زندگی کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہو گا اُسے وہیں لگایا جائے گا اور اس طرح قوم کا زیاں نہیں ہو گا

• ریاست جو جبر کا سب سے بڑا اوزار ہے، خود بخود ختم ہو جائے گی۔

اشتراکیت جس راستے سے ان مقاصد کو پہنچنا چاہتی ہے اُس کے بنیادی اصول یہ ہیں:

(ا) دولت کی شخصی ملکیت کا استیصال کر دیا جائے۔

(ب) دولت، اور وسائل دولت آفرینی پر تمام حقوق مالکانہ جماعت، کو حاصل ہوں۔

(ج) دولت آفرینی اور تقسیم دولت کا پورا انتظام جماعت، کے ہاتھ میں ہو جس کی طرف سے حکومت اس وظیفہ کو سرانجام دے۔

مارکس اور اس کے رفقائے کار نے ان عزائم کا مختلف طریقوں سے اظہار کیا ہے۔ چنانچہ منشور اشتراکیت کے شروع ہی میں ان کی یوں صراحت کی گئی ہے۔

"سرمایہ داری نے جو فتنہ و فساد برپا کر رکھا ہے اس کا واحد علاج یہ ہے کہ دنیا سے طبقاتی تفریق کو مٹا دیا جائے۔ عمرانی زندگی کے مصائب و آلام صرف طبقاتی اختلافات کی بنا پر ہیں اور اس کا ازالہ مزدوروں کی جماعت ہی برسر اقتدار آکر عالمگیر یکسانیت و مساوات پیدا کرتا ہے"

پھر کہا جاتا ہے:۔

"اس تحریک کا مقصد وحید یہ ہے کہ دنیا سے ذاتی ملکیت اور شخصی و انفرادی حقوق کے خیال کو فنا کر دیا جائے اور اس طرح جب مزدوروں کی جماعت کو تسلط حاصل ہو جائے تو تدریجاً ملک کے تمام املاک و خزائن پر قبضہ کر لیا جائے اور یوں ملکی پیداوار کے تمام وسائل و ذرائع مزدوروں کی جماعت کی حکومت کے ہاتھ میں مرکوز کر دیئے جائیں۔

اسی طرح انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مدیر مارکس و لینن کی اسناد سے اشتراکیت کے حاصل الحصول کے متعلق لکھتا ہے:

"مشترکہ ملکیت، وسائل پیداوار کا اجتماعی نظم و نسق اور انفرادی و شخصی حقوق و املاک کا مکمل انقطاع، سوشلسٹوں کا نصب العین حیات ہے"

اس "مشترکہ ملکیت" کے نصب العین کا حصول بہر حال کوئی کھیل نہ تھا کہ بس ہنسی خوشی انجام پا جاتا۔ یہ ایک بڑا ہی سخت کام تھا جو روس تک مسلسل نہایت ہولناک ظلم و ستم کرنے سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اور ایسا ہونا بالکل فطری امر تھا کیونکہ اس انقلاب کا مقصد لوگوں کے ہزاروں سالوں کے تصورات کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر ان کی جگہ بالکل نئے تصورات اور اعتقادات کو رواج دینا تھا۔ یہ چیز انسان کی سرشت میں ہے کہ وہ اپنی محنت کے حاصل کا خود مالک اور مختار ہونا چاہتا ہے، وہ اپنی مساعی کی پیداوار کو "میری" کہنا چاہتا ہے۔ کارگہِ حیات میں جس قدر محنت اور جد و جہد بھی کی گئی ہے اس کا بیشتر حصہ اسی خواہش کو پورا کرنے کے لیے صرف ہوا ہے۔ اب اگر انسانوں کا کوئی گروہ لاکھوں انسانوں کو ان کی جائز املاک سے زبردستی بے دخل کرنے کا عزم کرے تو اسے لامحالہ بیشمار انسانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے ہونگے۔ چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جس قدر ظلم و تشدد اور قتل و غارت ہوا ہے اس کا کچھ اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہو سکے گا جو مسٹر جون وائن ہرڈ (JOHN WYNNE HIRD) نے اپنے تیس سالہ قیام روس کے زمانہ میں فراہم کیے تھے اور جو ڈیلی گزٹ کراچی کی اشاعت مورخہ ۵، ۶ جون ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئے تھے:۔

تعدادِ مقتولین

اساقیف	۳۱
اہلِ خدماتِ کلیسہ	۱۵۶۰
جج۔ وکلا اور مجسٹریٹ	۲۲۵۸۵
اساتذہ اور طلبا	۱۶۳۶۷
سول حکام	۷۹۹۰۰
امرا اور رؤسا	۶۵۸۹۰
فوجی افسر	۵۶۳۴۰
مزدور اور محنت پیشہ لوگ	۱۹۶۰۰۰
سپاہی اور ملاح	۳۶۰۰۰
کسان اور کاشتکار	۸۹۰۰۰۰

ان اعداد و شمار پر ایک نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ کیا یونانیوں کی ستم ریزیاں، ایرانیوں کی لشکر انگیزیاں اور ہلاکو خاں کی قتل و غارت گری کی خوں فشاں قیامت خیزیاں اس فہرست کے مقابلہ میں کوئی حیثیت رکھتی ہیں، اور اس ضمن میں یاد رہے کہ یہ نتائج اس اشتراکیت کے ہیں جس کے متعلق خود لینن کا دعویٰ تھا کہ یہ تحریک حکومت اور جنگ کی دہشتوں سے نجات دلانے کی صراطِ مستقیم ہے[1]۔

---

[1] اشتراکیوں کے ہاتھوں ان مظالم کا ڈھایا جانا کوئی خلافِ توقع بات نہیں بلکہ یہ سب کچھ اشتراکی تعلیم کے عین مطابق ہوا۔ مارکس کے منشور کے بعد تحریکِ اشتراکیت میں لینن کی کتاب ریاست اور انقلاب (STATE AND REVOLUTION) سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اُس میں درج ہے:

"سرمایہ دارانہ نظامِ حکومت کی جگہ اشتراکیین کی حکومت کا برسرِ اقتدار آجانا تشدد آمیز انقلاب کے بغیر ممکن نہیں"

"فرد، جماعت اور آزادی [illegible] انقلاب [illegible]"

(باقی ۳۸۶ پر)

پھر یہ سارا ظلم اور تشدد بھی گوارا کر لیا جاتا اگر اس سے وہ نتائج حاصل ہو جاتے جن کی اشتراکیت دعویدار تھی۔ ذرائع پیداوار کو حکومت کی تحویل میں دے دینا اس کا اصل مقصود نہ تھا بلکہ یہ اصل نصب العین کو حاصل کرنے کا ایک موثر ذریعہ تھا۔ اس تحریک کا اصل مقصد مختلف انسانوں کے درمیان اجتماعی عدل کا قیام ہے۔ اشتراکیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب افراد کے تسلط سے ذرائع پیداوار کو نکال کر انہیں پوری قوم کے حوالے کر دیا جائے۔ کیونکہ اسی طرح "مفاد ملی" کی حفاظت ممکن ہے۔ افراد کی ملکیت میں ذرائع پیداوار کا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ دنیا میں ظلم و جبر کا دور دورہ ہے، اور سرمایہ دار مزدوروں اور بے سہارا لوگوں کا خون چوس چوس کر اپنے شبستانِ عیش کے چراغ جلا رہے ہیں۔

اشتراکیت ساری دنیا میں نہ سہی، بلکہ صرف چند ممالک میں ذرائع پیداوار کو افراد کے ہاتھوں سے چھین کر حکومت کے سپرد کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ مگر افسوس کہ اس عظیم الشان اور بنیادی تبدیلی کے باوجود جو لاکھوں انسانوں کا خون بہا کر عمل میں لائی گئی۔ عوام کو کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ پہلے اگر ملک کا سرمایہ دار طبقہ ان کو لوٹتا تھا تو اب یہ "فرض" حکومت کے مقدس ہاتھوں سرانجام پاتا ہے۔ اس خونی انقلاب سے پیشتر اگر غریب مزدور کی محنت سے حاصل شدہ قدر زائد (SURPLUS VALUE) امیر ہتھیا لے گا، تو اب اس سے حکومت اور اس سے ذاتی مفاد وابستہ رکھنے والے اصحاب مستفید ہو رہے ہیں۔ فرق جو

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۵) تخریب کے بغیر ممکن نہیں۔"

اسی طرح انجلز کا ارشاد ہے:

"انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رو سے آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصہ پر اپنا اختیار و ارادہ، قوت و استیلاء، نوک شمشیر، گولیوں کی بوچھاڑ اور آتشیں گولوں کے دھماکوں سے زبردستی مسلط کر دیتا ہے۔"

وی۔ اے۔ ایڈورسکی (V. A. ADORUTSKY) اپنی کتاب جدلی مادیت (DIALECTICAL MATERIALISM) میں لکھتا ہے:۔

"نسلِ انسانی صرف قوت بازو سے جو اشتراکیت کی شکل میں موجود ہے، نیم بربریت کی زندگی اور افلاس، استبداد اور جہالت کے شکنجہ سے رہائی پا سکتی ہے، نہ کہ خدا کی مدد کے بھروسہ پر جس کے متعلق ہمارا یقین یہ ہے کہ اس کا وجود ہے ہی نہیں۔"

کچھ ہوا ہے وہ یہ کہ چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کو نگل کر حکومت خود ایک بہت بڑے سرمایہ دار کی حیثیت سے قوت کے تخت پر متمکن ہو گئی ہے۔

علم معاشیات کا ایک مبتدی بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ جہاں سماج کے وسائل پیدائش کے استعمال کی عام آزادی ہو گی، وہاں قدر (VALUE) اشیاء، زر تبادلہ، اور منڈی سب کے سب بے معنی الفاظ ہونگے ۔ کیونکہ کسی سماج میں بھی ان کا وجود اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ وہاں افراد کو ذاتی ملکیت کا حق حاصل ہے۔ ایک فرد اسی شے کا تبادلہ کر سکتا ہے جو اُس کی ملک ہے ۔ اور اسی عمل سے قدر معرض وجود میں آتی ہے ۔ پھر اس قدر کو ناپنے کے لیے کوئی ایک معیار ہونا بھی ضروری ہے اور اسی کو معاشیات کی اصطلاح میں سکہ کہا جاتا ہے ۔ جس ملک اور قوم میں سکہ کا رواج ہوگا وہاں سماج کے مختلف طبقوں میں صرف معاشیات کے بل بوتے پر مساوات قائم نہیں کی جا سکتی ۔

روس میں اجتماعی عدل کو حاصل کرنے کے لیے اوائل انقلاب میں سکہ کے استعمال کو ختم کیا گیا مگر چند سال گزرنے بھی نہ پائے تھے کہ روبل کا سکہ پورے " خلوص" کے ساتھ روسی منڈیوں میں بجنے لگا ۔ ایم لارین (M. LARINE) بوچرین (BUCHARINE) اور کریسٹنشی (KRESTNSHI) نے حکومت کے اس " رجعت پسندانہ " اقدام کے خلاف آواز اٹھائی مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ انہیں اپنی صاف گوئی کے الزام میں موت کی آغوش میں پناہ لینی پڑی ۔

جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے اُس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ معاشی لوٹ کھسوٹ اور جبر و استبداد کا اصل ذمہ دار سکہ ہے بلکہ اس کا وجود تو اس بات کی شہادت ہے کہ سوسائٹی میں مختلف طبقے موجود ہیں، اور ان کے معیار زیست میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔ اس کے ثبوت کے لیے ایک فرانسیسی کمیونسٹ کامریڈ یان (YUON) کی رائے قابل غور ہے ۔ روس کے معاملات پر اس کی نظر سرسری اور سطحی نہیں بلکہ اُس نے روسی مشین کے کل پرزہ کی حیثیت سے اشتراکیت کی تعمیر میں ایک نمایاں حصہ لیا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے :-

" روس کے اندر طبقہ واریت پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے ۔ یہاں امرا بھی ہیں

اور غرباء بھی: غالب بھی ہیں اور مغلوب بھی۔ ان کے معیار زیست میں نمایاں تفاوت ہے۔ ریل کے ڈبوں، جہازوں اور ریستورانوں میں مختلف درجوں کا پایا جانا اس طبقہ واریت کی ایک کھلی اور بین دلیل ہے۔ کچھ خوش نصیب لوگ صحت افزا مقامات پر بڑے بڑے محلات میں نہایت آرام اور عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں، مگر بہت سے سیاہ بخت جھونپڑیوں تک کے محتاج ہیں۔ یہاں ذاتی ملکیت کا احاطہ نہایت ہی محدود ہے، بلکہ سب کچھ ریاست کے بت پر چڑھا دیا گیا ہے مگر ریاست مفاد عمومی کے لیے قائم نہیں کی گئی بلکہ اس کا فائدہ چند افراد کو حاصل ہوتا ہے۔ عوام کا فرض صرف ریاست کے بقا کے لیے جدوجہد کرنا ہے، اس کی بہتری کے لیے کوشاں رہنا، اس کا احترام کرنا اور اس سے خائف ہونا ہے۔ اس کو عوام کی بہتری اور خوشحالی سے کوئی سروکار نہیں۔ سرمایہ دارانہ ممالک کی پولیس سے کہیں زیادہ جبار اور قہار پولیس کمزوروں سے ان کی محنت کے ثمرات چھین کر ان کو برسر اقتدار طبقہ کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کر دیتی ہے۔ سرمایہ کے ارتکاز نے بلاشبہ ایک نئی جماعت کو جنم دیا ہے۔ مگر اس سے کہیں یہ لازم تو نہیں آتا کہ نئی جماعت صرف محنت کشوں پر مشتمل ہے۔ پہلے جس مقام پر سرمایہ دار فائز تھے اب وہاں بڑے بڑے حکام اور اعلیٰ افسران متمکن ہیں۔ غریب مزدوروں نے غلامی کی زنجیروں کو توڑا نہیں بلکہ بدلا ہے، اور یہ نئی زنجیریں پہلی زنجیروں سے کہیں زیادہ مضبوط اور وزنی ہیں۔ روسی عوام نے ۱۹۱۷ء میں اس انقلاب کو بڑی قربانیوں کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچایا مگر روس کی باقی تاریخ اب صرف عیاری کی تذکرہ نگاری ہے جس کے دام میں عوام کو پھنسایا گیا ہے"۔

ممکن ہے اشتراکیت کے بعض پرجوش حامی یان (YUON) کی ان تصریحات کو محض یہ کہہ کر مسترد کر دیں کہ یہ شخص ایک مخلص کامریڈ نہ تھا بلکہ سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہونے کی بنا پر اس نے جنت ارضی کو بدنام کیا ہے۔ اس لیے ہمیں ایک فرد کی رائے پر یقین کر کے کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ بات کسی حد تک معقول اور وزنی ہے۔ ایک فرد یا چند افراد کی محض رائے سے کسی چیز کے متعلق کوئی قطعی اور حتمی فیصلہ صادر

نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے مزید غور و خوض اور چھان پھٹک درکار ہے۔ مگر اس سے کہیں یہ لازم تو نہیں آتا کہ ہم ہر بات کو صرف اس لیے رد کر دیں کہ یہ "محض رائے" ہے۔ یہاں اصل کو نقل سے، حق کو باطل سے، بھلے کو بُرے سے، نفع کو نقصان سے ممیز کرنے کے لیے "روایت و درایت" کے چند متعارف اصول ہیں جن کی مدد سے یہ کام کیا جا سکتا ہے۔

اشتراکی حضرات کا رویہ اس معاملہ میں سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ ایک نہیں بلکہ ہزاروں اشخاص تحریکِ اشتراکیت کے علمبردار کی حیثیت سے اپنی جان تک کی بازی لگاتے ہیں۔ مگر جب یہ نظام واقعات کی دنیا میں اُن کے سامنے آتا ہے تو بے اختیار ان کے مُنہ سے یہ بات نکل جاتی ہے ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس آہ کے نکلتے ہی وہ غدار، عیار اور "دشمنِ ملک و ملت" قرار پاتے ہیں۔ اور کوئی غور نہیں کرتا کہ کل تک جو شخص "جانِ جہان" تھا وہ آج کیونکر "ننگِ وطن" ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کا درخشاں ماضی ان کے اخلاص پر پوری شہادت فراہم کرتا ہے۔ مگر روس کے صاحبِ اختیار طبقہ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

اختلاف، خواہ ٹراٹسکی کرے یا یاں، او ٹیلے کرے یا بیریا، سب کے سب جھوٹے، بے ضمیر اور فقتہ کالمسٹ ہیں اور اُن کی کسی بات کو سننا اشتراکیت کے ساتھ بیوفائی کے مترادف ہے۔ روس کے اربابِ بست و کشاد نے یہ الزامات اپنے مخالفین پر اس شدت سے لگاتے ہیں کہ آدمی یہ سوچنے لگتا ہے کہ گویا اشتراکیت کے حامیوں میں سے کوئی بھی مخلص اور دیانت دار نہیں۔ کیا اس تحریک نے ایک فرد بھی ایسا پیدا نہیں کیا جس کی سیرت پر مکمل اعتماد اور بھروسہ کیا جا سکے۔ کیا یہ سارا نظام ہی "غداروں" کے بل بوتے پر چل رہا ہے۔

چنیے ہم ایک لمحہ کے لیے یہی فرض کر لیتے ہیں کہ حکومت سے اختلاف کرنے والے سب جھوٹے اور مکار تھے۔ ان سے اشتراکیت کو کسی بھلائی کی توقع نہ تھی، انہوں نے آئیڈیل کے مقابلے میں ہمیشہ اپنے شخصی مفادات کو ترجیح دی۔ ہم اس بات کو بھی ایک منٹ کے لیے مان لیتے ہیں کہ آہنی پردے سے

چھن چھن کر حالات کی جو صورت وقتاً فوقتاً باہر آتی ہے وہ سب غلط اور کسی دشمن کی اڑائی ہوئی ہوائی ہے۔ مگر ان واقعات کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے جن کو اشتراکی حکومت نے خود تسلیم کیا ہے۔

اشتراکیت کی تحریک معاشی مساوات[1] کے اصول پر اٹھائی گئی۔ اسی جذبہ نے عوام کو سرگرم عمل کیا اور انہوں نے بے پناہ قربانیاں دیں مگر جب یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا تو فوراً کہا گیا کہ ہمارے سامنے کب یہ مقصد ہے۔ چنانچہ سٹالن نے نہایت ہی واشگاف الفاظ میں کہا:۔

"یہ لوگ (معاشی عدم مساوات کی پالیسی کے خلاف آواز بلند کرنے والے بالشویک) شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اشتراکیت مساوات کی داعی ہے، اور اس کا مقصد معاشرہ کے اراکین کی ضروریات اور ذاتی احتیاجات کے معیار کو مساوی کر دینا ہے، یہ لوگ ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں، اشتراکیت کے پیش نظر ذاتی ضروریات اور احتیاجاتِ زندگی میں برابری پیدا کرنا نہیں تھا، بلکہ صرف طبقہ واری تقسیم کو ختم کرنا تھا۔"[2]

اب سوال یہ ہے کہ کیا طبقہ واری تقسیم کا ختم کرنا بذاتِ خود کوئی مقصد ہے یا کسی بلند تر مقصد کے حصول کا ذریعہ۔ ظاہر بات ہے کہ یہ از خود کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔ اس کے ختم کرنے سے بھوک، افلاس، جہالت، اور بیماری کا خاتمہ مقصود تھا۔ انیسویں صدی میں انگلستان کے مزدور جس فاقہ مستی کا شکار تھے۔ جس خستہ حالی اور مظلومیت میں مبتلا تھے انہوں نے مارکس[3] اور اس کے رفیق انجلز[4] کو غور و فکر پر ابھارا

---

[1] لینن کا قول ہے: "کسی اعلیٰ افسر کی تنخواہ کسی صورت میں ایک عام مزدور کی تنخواہ سے زیادہ نہ ہونے پائے۔"

[2] J. STALIN SEVENTEENTH CONGRESS OF C.P.N.S.N. 1934.

[3] سرمایہ میں وہ کہتا ہے: "اگر آگیر کے قول کے مطابق سکہ دنیا میں انسانی رخساروں پر خون لاتا ہے تو اس کے مقابلہ میں سرمایہ مزدوروں کے جسم کے ہر مسام سے خون نچوڑتا ہے۔"

[4] انجلز نے ان احساسات کا اظہار یوں کیا ہے:

"اگر مزدور اتنا خوش نصیب ہے کہ اسے کام مل جائے، یعنی سرمایہ دار اس پر صرف اتنی نوازش کرے کہ اسے اپنے آپ کو دولتمند بنانے کا ذریعہ بنائے۔ تو اس صورت میں اس بد نصیب کا معاوضہ

(باقی صفحہ ۳۹۱ پر)

اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس بربادی کا اصلی سبب ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت ہے۔ اس کے ختم کرنے سے طبقہ واریت دفن ہو گی اور اس کے "پسماندگان" خواہ قیامت تک زندہ رہیں مگر انہیں یہ ہمت نہ ہو گی کہ سماج کے کسی طبقہ کو اپنی حرص وہوا کا آلۂ کار بنا سکیں۔ اب اگر طبقہ واریت کی موت سے صرف یہی مراد ہے کہ کسی ملک میں انفرادی ملکیت کا یکسر خاتمہ کر دیا جائے تو اس لحاظ سے روس میں کوئی طبقاتی تقسیم نہیں۔ اگر ناجائز انتفاع کا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں بے سہارا مزدور اپنے آپ کو ایک صاحبِ جائداد انسان کے ہاں اپنی محنت کو بیچنے پر مجبور پاتا ہے۔ تو اس نقطۂ نظر سے روس میں کوئی استحصال (EXPLOITATION) نہیں، کیونکہ وہاں کسی فرد کو بھی ایک خاص مالیت سے زیادہ جائداد رکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ مگر یہ ناجائز انتفاع، استحصال، اور لوٹ کھسوٹ کوئی ایسی روحانی اور قلبی کیفیات نہیں جن کو کسی محسوس شکل میں دیکھا نہ جا سکے یہ وہ افعال ہیں جن کے نتائج اس آب وگل کی دنیا میں ٹھوس صورتوں میں ہمارے سامنے ظاہر ہوتے ہیں

جس طبقہ اور سوسائٹی میں ان کی "گرم بازاری" ہو گی وہاں انسان دو مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہوں گے۔ ایک مزدوروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے، اور دوسرے محنت بیچنے والے۔ ان کو پہچاننے کے لیے کسی زیادہ علم اور تجسس کی ضرورت نہیں۔ ہر انسان بادی النظر میں انہیں جان سکتا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۰) صرف اسی قدر ہے کہ وہ بڑی مشکل سے جسم اور روح کے رشتے کو قائم رکھ سکتا ہے۔ اگر اُسے کام نہیں ملتا تو وہ مجبوراً چوری کرتا ہے۔"

وہ پھر لکھتا ہے:-

"وہ آلو جو بالعموم غربا خریدتے ہیں نہایت ناقص ہوتے ہیں، وہ باسی پنیر اور نہایت گھٹیا قسم کے گوشت کو بطور غذا کے استعمال کرتے ہیں۔ غذا میں عام طور پر ملاوٹ کی جاتی ہے مگر اس کا سب سے زیادہ نقصان غربا کو برداشت کرنا پڑتا ہے کیونکہ امرا زیادہ قیمت ادا کر کے اچھی دکانوں سے مال خرید سکتے ہیں۔" (انگلستان کے مزدور طبقہ کے حالات (CONDITION OF WORKING CLASSES IN ENGLAND)

ہے۔ دنیا میں جس جگہ عالیشان محلات کے پہلو میں جھونپڑے موجود ہوں، عیش و عشرت کے مقابلے میں افلاس دکھائی دے سکے، آرٹ، کلچر کے مقابلہ میں جہالت نظر آئے، صحت اور تندرستی کے مقابلہ میں بیماری پائی جائے، وہاں سمجھ لیجئے کہ طبقہ داریت کا دیو حکومت کر رہا ہے۔ سرمایہ دار اور مزدور کی زندگیوں کے معیار میں تفاوت ہی طبقاتی تقسیم کے وجود کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ لیون ٹراٹسکی (LEON TROTSKY) اپنی تصنیف "فریبِ انقلاب" (REVOLUTION BETRAYED) میں روس میں استحصال کی علامات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"جہاں تک عوام کا تعلق ہے نہ ان کے پاس مویشی ہیں اور نہ باغات۔ اور اکثر تو مکانوں تک سے محروم ہیں۔ ایک مزدور کی سالانہ آمدنی بارہ سو پندرہ سو روبلز ہے۔ روس میں یہ آمدنی ضروریاتِ زندگی کی گرانی کے مقابلہ میں اس قدر کم ہے کہ اس سے سانس تک کو برقرار رکھنا محال ہے۔ لوگوں کی بود و باش (جو کسی قوم کے معیارِ زیست کی سب سے بڑی اور قابلِ اعتماد نشانی ہے) نہایت ابتر ہے۔ محنت کشوں کی عظیم اکثریت چھوٹے چھوٹے اور خستہ حال جھونپڑوں میں جانوروں کی طرح رہتی ہے . . . یہ واقعات اس قدر زیادہ ہیں کہ انہیں بیان نہیں کیا جا سکتا"[1]

اس طرح فینر براک وے (FENNER BROCK WAY) نے اپنی تالیف "محنت کشوں کے محاذ" (WORKERS FRONT) میں اس اندوہناک صورتِ حالات کا یوں تذکرہ کیا ہے:-

"روس میں جہاں مزدوروں نے ۱۹۱۷ء میں عدیم المثال فتح حاصل کی تھی، آمدنی میں تفاوت روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور اشتراکی سماج جس کی زندگی کا ساز معاشی مساوات کے تاروں پر چھیڑا گیا تھا اب نجی وراثت کے اجرا کے بعد اپنی تان شدید قسم کی طبقہ واریت اور معاشی ناہمواری پر توڑ رہا ہے۔"

کامریڈ یوین (YVON) نے روسی باشندوں کے معاوضوں کی جو تفصیلات دی ہیں وہ قابلِ غور ہیں:-

---

[1] REVOLUTION BETRAYED = LEON TROTSKY PP 123-24.

کم سے کم تنخواہیں		زیادہ سے زیادہ تنخواہیں	
عام مزدور پیشہ لوگ	۸۰ روبل	عام مزدور پیشہ لوگ	۴۰۰ روبل
معمولی ملازمین	۸۰ روبل	معمولی ملازمین	۳۰۰ روبل
گھریلو نوکرانیاں	۵۰ روبل مع خوراک	گھریلو نوکرانیاں	۶۰ روبل مع خوراک
ماہر صنعت	۳۰۰ روبل	ماہر صنعت	۸۰۰ روبل
ذمہ دار منتظمین اور ماہرین	۱۵۰۰ روبل	ذمہ دار منتظمین اور ماہرین	۱۰،۰۰۰ ″
بڑے بڑے پروفیسر آرٹسٹ اور مصنفین	۲۰،۰۰۰ ″	بڑے بڑے پروفیسر آرٹسٹ اور مصنفین	۳۰،۰۰۰ ″

یہ اعداد و شمار اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ روس میں آمدنی کے اعتبار سے ہر ایسا طبقہ موجود ہے جس کو کوئی بڑے سے بڑا سرمایہ دارانہ نظام جنم دے سکتا ہے۔ یہ وہ بدیہی شہادتیں ہیں جن کا روس کے ارباب بست و کشاد نے دبی زبان میں اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ کامریڈ سیکمس SEKIMS رقمطراز ہے:-

"جنگ سے پیشتر ایک عام مزدور ۲۵ روبل اور ماہر صنعت ۵۰۰ روبل ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ اب یہ فرق ۶۰۰ روبل سے ۳۰۰۰ روبل تک پہنچ گیا ہے یعنی ایک ماہر منتظم یا بڑا افسر ایک عام مزدور کے مقابلہ میں ۵ گنا زیادہ تنخواہ پاتا ہے۔ ہم درحقیقت اپنے ماہرین کو بہت سے زیادہ تنخواہ دے رہے ہیں۔"

یہ تو ہے تنخواہوں میں تفاوت۔ پنشن میں یہ فرق اور بھی نمایاں ہے۔ ڈاکٹر بینرلی اپنی تصنیف "روس سوویٹ عہد حکومت میں" RUSSIA UNDER THE SOVIET RULE میں لکھتا ہے:-

"پنشن کی رقم جو روسی مزدور کو اپنی قوت کے زائل ہو جانے کے بعد دی جاتی ہے بہت ہی قلیل ہے اور اس وجہ سے وہ اس میں کوئی جاذبیت نہیں پاتا۔ یہ عام طور پر ۲۵ اور پچاس روبلز کے درمیان ہوتی ہے اور بہت ہی کم پنشنوں میں ۱۰۰ یا ۸۷ روبل تک

پہنچتی ہے۔ جو شخص روس میں ۱۵۰ سے ۲۰۰ روبلز ماہانہ کماتا ہے وہ نہایت افلاس کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ان حالات کے پیش نظر آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک محنت کش کے لیے ملازمت کی میعاد کا ختم ہونا کس قدر روح فرسا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس میں مزدور ستر سال کی عمر پا لینے کے بعد بھی ملازمت کو جاری رکھنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ حکومت ایک طرف نہایت ڈھٹائی سے ایک مزدور کو جس نے اپنی عمر عزیز کے [illegible] سال مشین کے سامنے کھڑے ہو کر گزارے ہیں صرف ۲۵ روبلز ماہانہ دیتی ہے۔ مگر اس کے برعکس اپنے اہل کاروں اور عہدہ داروں کو پندرہ سو روبلز سے نوازا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ازیں اُن کے رہنے کے لیے ایک آرام دہ مکان کا انتظام بھی ہوتا ہے[1]۔"

کیا یہ سب شواہد اس بات کی غمازی نہیں کرتے کہ یہاں کے اعلیٰ طبقہ کی ساری عیاشیاں اس ملک کے "غریب محروم" انسانوں کی محنت کا ماحصل ہوتی ہیں۔ سرمایہ دارانہ ممالک میں غریبوں کا خون خود سرمایہ دار اپنے ہاتھوں سے نچوڑتا ہے اور یہاں یہ کام حکومت کی وساطت سے کیا جاتا ہے۔ روس کے بااختیار طبقہ کو جو جو فوائد حاصل ہوتے ہیں اُن میں ان مزدوروں کے علاوہ ان بدنصیب انسانوں کا بھی حصہ ہے جنہیں حکومت نے سائبیریا کے اجتماعی کیمپوں (CONCENTRATION CAMPS) میں قید کر رکھا ہے۔ "یہ لوگ ایک نہ ختم ہونے والی غلامی میں گرفتار ہیں۔ انہیں صحت اور زندگی دونوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔ امید کی کوئی کرن بھی اُن کی زندگی کے اندر حرارت اور حرکت پیدا نہیں کر سکتی۔ ان کے پاس سوائے غلامی کی زنجیروں کے اور کوئی چیز باقی نہیں[2]۔"

پھر یہ لوگ دس، بیس، سو یا ہزار نہیں بلکہ ان کی تعداد لاکھوں اور کروڑوں تک پہنچتی ہے۔ وکٹر کریوشنکو VICTOR KREVCHENKO نے اپنی کتاب "میں آزادی کو انتخاب کرتا ہوں" (I CHOSE FREEDOM) میں لکھا ہے:-

---

۱. DR. BASILY : RUSSIA UNDER THE SOVIET RULE

۲. DAVID J. DALLIN AND BORIS I. NICOLAEVSKY : FORCED LABOUR IN RUSSIA

"ہماری صنعت کا سب سے بڑا سہارا قیدیوں کی ایک بہت بڑی فوج تھی جس میں ہر آن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سرکاری حلقوں کا کہنا ہے کہ یہ تعداد کروڑوں سے بھی زیادہ تھی۔ اس تعداد میں چودہ سال سے لے کر سولہ سال تک کے بچے بھی شامل ہیں جن کو بجبر اپنے والدین سے الگ کر کے سائبیریا بھیج دیا گیا۔ سوویٹ روس کی جنگی صنعتوں کا انحصار زیادہ تر انہیں غلاموں پر ہے۔"

اسی طرح بروکس ایٹکنسن (BROOKS ATKINSON) نے ماسکو سے واپس آکر اس حقیقت کا یوں اظہار کیا ہے:

"کوئی شخص بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت کتنے انسان جلاوطنی کی حالت میں ہیں یا قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے ہیں۔ لیکن اندازہ یہی ہے کہ ان کی تعداد ایک کروڑ اور ڈیڑھ کروڑ کے درمیان ہے۔"

آدم کی یہ مظلوم اولاد جس بے کسی میں اپنی زندگی بسر کرتی ہے وہ تاریخ انسانی کی ایک المناک داستان ہے۔ یہاں ہم اس کے صرف چند پہلوؤں کا تذکرہ کرتے ہیں:

"ان لوگوں کی خوراک کے بارے میں عام پالیسی یہ ہے کہ انہیں کم سے کم کھانا دیا جائے تاکہ حکومت کو ان کی محنت سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل ہو۔ فاقہ مستی کے دیو کو ان پر ہر وقت مسلط رکھا جاتا ہے اور زائد خوراک کا لالچ دے کر ان سے ان کی قوت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ کام لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ ایسے بے شمار واقعات موجود ہیں جہاں ان قیدیوں نے مچھلی کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے جان تک کی پروا نہ کی اور اتنی بے جگری سے کام کیا ہے کہ جان تک جاتی رہی۔"

ان سے کس ظلم اور تشدد کے ساتھ کام لیا جاتا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف اس بیان پر غور کیجیے:-

"قیدیوں کو صبح چار اور پانچ بجے کے درمیان معمولی خوراک دے کر کام پر بھیج دیا جاتا ہے۔

(1) FORCED LABOUR IN RUSSIA

یہاں وہ سات بجے شام تک کام کرتے ہیں۔ دن بھر کی محنت اور بھوک سے وہ اس قدر نڈھال ہو جاتے ہیں کہ اُن کے لیے اپنی بارکوں میں واپس آنا مشکل ہو جاتا ہے۔[۱]

اس ضمن میں اس امر کی صراحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ ان کیمپوں میں جو شخص بھی لایا جاتا ہے وہ لازمی طور پر مجرم ہی نہیں ہوتا بلکہ ان میں خاصی تعداد اُن بے گناہوں کی بھی ہوتی ہے جن کی آزادی کو محض کسی منصوبہ کی تکمیل کے لیے سلب کر دیا جاتا ہے۔ حکومت اس بات کو اچھی طرح جانتی ہے کہ ان لوگوں پر کم سے کم صرف کر کے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کر سکتی ہے، اس لیے کسی اسکیم کے جاری کرنے سے پیشتر خفیہ پولیس کو اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ سرکار عالی مدار کو اتنے افراد کی خدمات درکار ہیں۔ چنانچہ یہ "مقدس گروہ" ملک کے کونے کونے سے "غداروں" کو تلاش کر کے انہیں "پرولتاریہ حکومت" کے حضور میں پیش کر دیتا ہے تاکہ وہ ان سے اشتراکیت کی تعمیر میں مدد لے۔

پچھلے صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی توقع کے خلاف نہیں۔ انہیں محض یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سٹالن اور اس کے رفقائے کار کی غلط روش کے ثمرات ہیں۔ انقلاب سے لے کر آج تک روس میں جس قدر ظلم و ستم بھی ہوا ہے، جن جن طریقوں سے کمزوروں اور بے سہارا لوگوں کو لوٹا گیا ہے وہ سب اشتراکی نظامِ فکر کے طبعی اور لازمی تقاضے ہیں۔ اس کی فطرت اور مزاج اسی قسم کی زندگی کو چاہتا ہے۔ اگر حالات اس کے برعکس ہوتے تو یہ چیز توقع کے خلاف ہوتی۔ اشتراکی حضرات کے طرزِ استدلال میں بنیادی خامی پائی جاتی ہے۔ اُن کے نزدیک

- سرمایہ دار ظالم ہے۔
- کیونکہ وہ اس کی مدد سے کمزوروں کی محنت کا ثمر خود لے لیتا ہے۔
- اس لیے سرمایہ دار کی انفرادی ملکیت کو ختم کر دینا چاہیے۔
- انفرادی سرمایہ جب ایک جگہ مرتکز ہو کر ان لوگوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے تو وہ اس سے ناجائز فائدہ حاصل نہیں کرتے۔

---

[۱] بحوالہ مذکور

مگر اس کے لیے علاج کیا سوچا گیا:

- سرمایہ کو ایک جگہ جمع کر کے اُسے ایک ایسے ادارے کی تحویل میں دے دیا گیا جو بذاتِ خود جبر اور ظلم کا آلہ ہے۔
- پھر اس ادارہ کا انتظام ایسے لوگوں کے سپرد کیا گیا جن کے نزدیک زندگی کا واحد مقصد مادی فوائد کا حصول ہے۔ اس سے زیادہ وہ کسی چیز کے قائل نہیں۔
- ان لوگوں سے آپ نے یہ توقع رکھی کہ اتنے بڑے وسائل ہاتھ میں آجانے کے بعد وہ عدل و انصاف کریں گے اور کسی شخص کو اس کی محنت کے ثمرات سے محروم نہیں رکھیں گے۔ کس قدر دلفریب ہیں آپ کی یہ توقعات، کس قدر مقدس ہیں آپ کی یہ آرزوئیں، مگر کس قدر حیرت انگیز ہے آپ کی یہ سادگی جس کی وجہ سے آپ ان "اشتراکی معجزات" پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

آئیے اب ہم ایک نظر میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ انسانیت نے اس انقلاب میں کیا کھویا اور کیا پایا۔ ضرورت سے زیادہ تفصیلات کو نظرانداز کرتے ہوئے اس کے تیس سالہ دور کا جو حاصل ہمارے سامنے ہے وہ یہ ہے:

- املاک یا منافع افراد کی جیبوں میں جانے کے بجائے حکومت کے خزانے میں آنے لگا۔
- نظامِ معیشت کے حکومت کی تحویل میں آجانے کی وجہ سے اس کی منصوبہ بندی ممکن ہوگئی۔
- ہر آدمی کو کام ملنے لگا۔
- مجموعی منافع کا ایک حصہ سوشل انشورنس کی مد میں صرف ہونے لگا۔

اس کے مقابلہ میں لوگوں کو اس کی جو قیمت ادا کرنا پڑی وہ یہ ہے:-

- انیس لاکھ جانیں اس انقلاب کی نذر ہوئیں، بیس لاکھ افراد کو نہایت وحشتناک سزاؤں کو برداشت کرنا پڑا۔ ۵۰ لاکھ کے قریب انسانوں کو ملک بدر کیا گیا۔
- مذہب و اخلاق کی ساری اقدار کو دلوں سے مٹانے کے لیے ظلم و تشدد کے بدترین طریقے استعمال کیے گئے۔

• لوگوں نے روٹی کے چند نوالوں کے لیے آزادی ایسی قیمتی چیز کو قربان کر دیا۔

• خدا سے غافل اور اخلاق سے عاری افراد کے ایک مختصر گروہ نے عوام پر ایک ایسا کلی اقتدار مسلط کر دیا ہے جس کی نظیر اس دنیا میں نہیں ملتی۔

• اولادِ آدم کی ایک بڑی تعداد کو اپنے خیالات: اپنے جذبات، اپنے احساسات، اپنے ذوق، اپنے قلم، اپنی زبان اور اپنی ہر چیز کو اس گروہ کے سامنے گروی رکھنا پڑا۔

ان حقائق کے پیشِ نظر ہر انسان خود یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ کیا انسانیت نے وہ جنت امن و سکون پالی ہے جس کا اشتراکیت نے اُس سے وعدہ کیا تھا۔

رسائل و مسائل

معاشی مسائل سے متعلق چند عملی سوالات و جوابات

[عدالتی بیانات کو چھوڑ کر "ترجمان" ایک عرصے سے مولانا مودودی کے قلمی افادات سے محروم ہے۔ ناظرین اس کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہوں گے۔ نومبر ۶۲ء میں مولانا محترم نے کراچی میں تجار کے ایک اجتماع کو خطاب کیا تھا۔ اصل تقریر تو غالباً نوٹ نہیں کی جا سکی لیکن تقریر کے آخر میں جو سوالات کیے گئے اور اُن کے جو جوابات دیے گئے تھے وہ سامعین میں سے ایک صاحب نے نوٹ کر لیے تھے۔ حال ہی میں خوش قسمتی سے دفتر کے کاغذات میں ہمیں یہ سوالات و جوابات مل گئے ہیں۔ مولانا سے ان کی تصحیح و تنقیح کرانا اس وقت ممکن نہیں تھا، اس لیے افادیت کے پیش نظر انہیں اسی حالت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ بیشتر سوالات اقتصادی موضوع سے ہی متعلق ہیں۔ ایک آدھ سوال عمومی نوعیت کا بھی ہے۔]

س۔ موجودہ زمانہ میں، جبکہ تجارت کا مدار بلکہ پوری معاشی زندگی سود کے بل پر چل رہی ہے اور اس کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس میں سود رچ بس نہ گیا ہو، کیا سود کا استیصال عملاً ممکن ہے؟ کیا سود کو ختم کر کے غیر سودی بنیادوں پر معاشی تعمیر ہو سکتی ہے؟

ج۔ اگر کوئی مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ سود ایک ناگزیر شے ہے اور موجودہ زمانے میں اس کے بغیر کوئی کام ہی نہیں چل سکتا، تو میرے نزدیک اس کا یہ خیال **بالکل باطل** ہے۔ یہ خیال نہ صرف اصولاً غلط ہے بلکہ خدا کے بارے میں سوءِ ظن ہے جس کے بارے میں ہمارا ایمان ہے کہ اس نے کسی ایسی چیز سے ہمیں نہیں روکا ہے جو انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہو اور جس کے بغیر دنیا کا کاروبار چل ہی نہ سکتا ہو۔ لیکن میں صرف اس نظری جواب ہی پر اکتفا نہیں کروں گا بلکہ یہ عرض کروں گا کہ خود موجودہ دور میں معاشیات کے ماہرین ولایت میں بھی اس طرف جا رہے ہیں کہ سود کی شرح کو کم سے کم حتیٰ کہ صفر کی حد تک پہنچا کر اسے ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اکثر ممالک میں شرحِ سود تیز رفتاری سے گر رہی ہے اور دنیا اس

مقام کے قریب تر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے جہاں سود سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ مجھے یہاں اس بارے میں تفصیلی بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں اپنی کتاب 'سود' میں اس موضوع پر مفصل تحریر کر چکا ہوں۔

البتہ میں یہاں مختصراً یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ایک اسلامی حکومت اس مسئلے کو عملاً کیسے حل کر سکتی ہے۔ میرے نزدیک اس کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ملک کے اندر سود کو بند کر دیا جائے۔ اس کے بعد دوسرے قدم کے طور پر بیرونی تجارت میں سود ختم کرنے کے لیے جدوجہد کی جائے۔ ملک کے اندر حکومت سودی لین دین کو قانوناً ناجائز قرار دے اور خود بھی سود کا لینا اور دینا ترک کر دے۔ کوئی عدالت سود کی ڈگری نہ دے۔ کوئی شخص اگر سودی کاروبار کرے تو اسے فوجداری جرم کا مجرم گردانا جائے جب تک آغاز ہی میں ایسے فیصلہ کن اقدامات نہیں کیے جائیں گے، اس امر کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں پیدا ہو سکے گا کہ کوئی ایسا مالیاتی نظام قائم ہو جو سود سے خالی ہو۔ اس حقیقت کو مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک حکومت اگر ایک طرف ریل کے سفر کے لیے ٹکٹ کو ضروری قرار دے دے اور دوسری طرف بغیر ٹکٹ کے سفر کے لیے بھی گنجائش باقی رہنے دے تو ٹکٹ لینے والے مسافر تھوڑے ہی نکلیں گے۔ لیکن اگر بلاٹکٹ کا سفر فوجداری جرم ہو تو کوئی آدمی جو ٹکٹ نہیں لیتا ریل میں جانے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح جب تک ہمارے ملک میں سود قانوناً حلال ہے، جب تک سودی لین دین کی اجازت ہے، جب تک ہماری حکومت خود سود لیتی اور دیتی ہے۔ جب تک ہماری عدالتیں سود کی ڈگریاں نافذ کرتی ہیں، اس وقت تک اس بات کا کوئی قطعی امکان نہیں ہے کہ حکومت یا کوئی دوسرا ادارہ کوئی ایسا بینکنگ سسٹم چلانے میں کامیاب ہو جو سود خواری کے بجائے حصہ داری کے اصولوں پر قائم کیا گیا ہو۔ البتہ اگر سودی بینک کاری کو پہلے قانوناً حرام کر دیا جائے تو ہمیں پوری توقع ہے کہ حصہ داری کے اصول پر ایسا سسٹم نشوونما پا سکتا ہے۔ حصہ داری سے ہماری مراد یہ ہے کہ نفع نقصان میں تمام حصہ دار برابر کے شریک ہوں۔ داخلی طور پر سودی بندش کے بعد خارجی لین دین میں بھی اس سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے انشاء اللہ کسی لڑائی جھگڑے کی نوبت نہیں

آئے گی بلکہ دوستانہ طریق پر مفاہمتی تعلقات قائم رکھتے ہوئے بھی دوسرے ممالک کو اس پر رضا مند کیا جا سکتا ہے۔

س:۔ اسلامی حکومت کی نیشنلائزیشن کے بارے میں کیا پالیسی ہونی چاہیے؟

ج:۔ میں نے جہاں تک اس مسئلے کا اسلام کی روشنی میں مطالعہ کیا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام ذرائع پیداوار کو قومی بنانے کے پروگرام کو بطور اصول کے اختیار نہیں کرتا۔ یہ چیز اسلام کے سارے اجتماعی نظام کے مزاج کے خلاف ہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے کسی ملک یا ریاست کے معاشی مسائل کا یہ صحیح حل نہیں ہے کہ سارے وسائل پیدائش کو قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ البتہ کسی صنعتی یا تجارتی شعبے کے بارے میں اگر تجربے سے یہ معلوم ہو کہ اسے شخصی تحویل میں رکھ کر فروغ دینا ممکن ہی نہیں ہے یا اس طرح رکھنے سے ایسے مفاسد پیدا ہوتے ہیں کہ جن کا سدباب کسی دوسرے طریقے سے ممکن ہی نہیں ہے، تو ایسی صورت میں اسے ریاست کے کنٹرول میں لیا جا سکتا ہے

س:۔ موجودہ ملازمین کی ایک بڑی تعداد میں بلندیٔ سیرت اور فرض شناسی کا جذبہ بہت ہی کم ہے، ایک اسلامی حکومت ان سے کیونکر کام لے گی؟

ج:۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حکومت کے ملازمین اور قوم کے بعض دوسرے افراد کی اخلاقی حالت نے پوری قومی زندگی کو بالکل کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ ایک بڑا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ میں اس کے حل کا طریقہ آپ کے سامنے مختصراً بیان کرتا ہوں۔ سب سے پہلے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انفرادی جرائم لازمی طور پر خدا سے بے خوفی اور آخرت سے بے فکری کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ تو خرابی کا بنیادی سبب ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اسباب ہیں جو ہماری معاشرتی زندگی میں پیدا ہو گئے ہیں اور جن کی وجہ سے یہ خرابیاں چاروں طرف پھیل رہی ہیں۔ مثلاً ہمارے معاشرے کے اوپر کے طبقے نے نہایت ہی عیاشانہ اور مسرفانہ زندگی اختیار کر رکھی ہے اس طبقے کی ضروریات صرف کھانے پینے، رہنے سہنے اور بچوں کی تعلیم کی حد تک محدود نہیں ہیں بلکہ انہیں ہزاروں روپے بعض دیگر مشاغل کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ جو لوگ ملک کا نظام چلا رہے ہیں ان

کا تعلق بھی اسی طبقے سے ہے۔ قاعدے کی بات ہے کہ اوپر والوں کے عملی نمونے نیچے والوں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ متوسط طبقہ اوپر والے طبقے کا اثر قبول کرتا ہے اور متوسط طبقے سے پھر ادنیٰ اور فروتر درجے کے لوگ اثر پذیر ہوتے ہیں۔ یہ متوسط اور بالکل نچلے طبقے کے لوگ تو ایک طرح سے اپنے آپ کو مجبور سمجھتے ہیں کہ وہ اپنا معیار زندگی قائم رکھنے کے لیے ہر طرح کے جائز و ناجائز ذرائع استعمال کریں۔

اب اگر آپ اس سارے مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں تو آپ ہرگز یہ توقع نہ رکھیں کہ صرف ایک طبقے کی اصلاح سے اور وہ بھی قانون کے بل پر یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس بیماری کی جڑیں معاشرے کی رگ رگ میں پھیل چکی ہیں۔ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ معاشرتی خرابیوں کو رفع کرنے کے لیے صرف قوانین پر انحصار نہیں کرتا۔ بلکہ وہ خرابی پر ہر پہلو سے اور زندگی کے ہر شعبہ سے حملہ آور ہوتا ہے۔ وہ تعلیم و تربیت کے ذریعے سے، تبلیغ و تلقین کے ذریعے سے، اصلاح اور انسدادی تدابیر کے ذریعے سے اور ساتھ ہی قانون کے زور و اثر سے برائی کو مٹاتا ہے۔ ایک اسلامی حکومت کو معاشرے کی اصلاح کے لیے یہ سارے کام کرنا ہوں گے۔ تعلیم گاہوں، نشر گاہوں، اخبارات اور پراپیگنڈے کی ساری طاقتوں کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنا ہوگا۔ پھر سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ عملاً اُن اسباب کو رفع کیا جائے جو اوپر والے طبقے کو اسراف پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس طبقے کے جو لوگ اونچی ملازمتوں میں ہیں اُن کی تنخواہیں بڑھانے کے بجائے گھٹانے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بیش قرار تنخواہیں ہی اُن کی فضول خرچیوں کا اصل باعث ہیں۔ نچلے درجے کے ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے کی ضرورت ہے، کیونکہ بسا اوقات حقیقی ضروریات کی فراہمی بھی انہیں بدعنوانیوں پر مجبور کر دیتی ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ ادنیٰ اور اوسط درجے کے ملازمین کی کثیر تعداد یہ چاہتی ہے کہ وہ رشوت خوری اور دوسری ناجائز کارروائیاں نہ کرے لیکن بعض حالات میں وہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ بہرحال اصلاح حال کے لیے یہ سارے اقدامات ناگزیر ہیں۔ ان سارے انتظامات کے باوجود جو لوگ رشوت اور خیانت سے باز نہ آئیں ایسے مجرمین کے لیے اس قسم کے قوانین ہونے چاہئیں جن کی زد سے انہیں پوری طرح عبرتناک سزائیں دی جائیں۔

اس موقع پر بعض لوگ یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ اس طرح بجٹ میں دفعتہً اضافہ ہو جائے گا کیونکہ

اس کا جواب یہ دیتا ہوں کہ اگر ہمارے سرکاری اور نیم سرکاری ملازمین رشوت کے بجائے ایماندار بن جائیں اور ان کا احتیاج بھی باقی نہ رہے تو حکومت کی آمدنی بہت آسانی سے کم ازکم دوگنی ہو سکتی ہے، کیونکہ رشوت، غبن اور خیانت کی وجہ سے حکومت کی بہت سی آمدنی تو خزانے تک پہنچنے ہی نہیں پاتی۔ اگر حکومت اس سے محروم نہ رہے تو وہ بسہولت تنخواہوں کے اضافے کو برداشت کر سکتی ہے۔ البتہ آغاز کار کے لیے حکومت کو شاید اس کی ضرورت پیش آئے گی کہ وہ پبلک سے بلا سودی قرضے طلب کرے۔ لیکن حکومت کی ساکھ اور اس کا اعتماد اگر قوم میں موجود ہو تو ایک اصلاحی اسکیم کے لیے سود کے بغیر قرض حاصل کر لینا کچھ بھی دشوار نہیں ہے۔ اگر حکومت، ملازمین اور عوام دیانت داری کے ساتھ اس مہم میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں تو شاید چند سالوں کے اندر رشوت و خیانت کا نام و نشان بھی مٹ جائے اور جائز ذرائع کے ساتھ ہر شخص اپنی ضروریات مہیا کرنے کے قابل بھی ہو جائے۔

سوال۔ کیا اسلام کی رُو سے پیشگی سودا بازی (FORWARD TRAN SACTION) ناجائز ہے؟

جواب - یہ ایک لمبی بحث ہے لیکن اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسلام میں پیشگی سودے کی صرف ایک شکل جائز ہے اور اس کا نام بیعِ سَلَم ہے۔ بیع سلم میں چند شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے:-

(۱) جس چیز کی خرید و فروخت ہو رہی ہو اس کا نام اور اس کی جنس کی نوعیت بالکل متعین ہونی چاہیے اور اس کا نمونہ بازار میں دستیاب ہونا چاہیے۔

(۲) لینے اور دینے والے کا تعین ہونا چاہیے۔

(۳) شے کی مقدار، قیمت اور شرح متعین ہونی چاہیے۔

(۴) اس وقت کا بھی تعین ہونا ضروری ہے جس وقت بائع مشتری کے سپرد مال کرے گا۔

(۵) پیشگی سودا کرتے وقت ساری قیمت کا ادا ہو جانا بھی لازمی ہے۔

اگر ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری نہ ہوگی تو یہ بیع فاسد قرار پائے گی۔

سوال۔ غیر ملکی تاجر جب ہم سے سود نہ لینے پر مجبور ہو جائیں گے تو کیا وہ اپنے مال کی قیمتیں

نہیں بڑھا دیں گے؟ کیا اس طرح سے سودی لین دین کا بند کرنا عملاً بے سود نہ ہو جائے گا؟

جواب۔ اگر غیر ملکی تاجروں کی واجب الادا رقوم کی ادائیگی کا یقینی اور قابل اعتماد انتظام ہو جائے تو غالباً وہ اپنے مال کی قیمتیں نہیں بڑھائیں گے۔ لیکن بالفرض اگر قیمتوں میں کچھ اضافہ بھی ہو جائے تب بھی ہماری تجارت حرام کی آلائش سے تو محفوظ ہو جائے گی اور یہ درحقیقت خسارے کا نہیں بلکہ بڑے نفع کا سودا ہے۔ علاوہ ازیں ہماری معاشی زندگی میں اسلامی انقلاب دنیا بھر کے لیے سبق آموز ثابت ہوگا۔ ہماری عملی مثال سے انشاء اللہ تمام قومیں اس بات کی قائل بلکہ اس پر راضی ہو جائیں گی کہ سود نہ جائز ہے اور نہ ناگزیر ہے۔

سوال۔ موجودہ بیرونی تجارت میں ایک عملی دقت یہ بھی ہے کہ اس کے لیے بنک میں (LETTER OF CREDIT) کھولنا ضروری ہوتا ہے، اور بغیر سود کے اس کا کھلنا ممکن نہیں ہے۔

جواب۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ حالات میں افراد اگر دوسرے ممالک سے تجارت کرنا چاہیں تو ان کے رستے میں کچھ نہ کچھ مشکلات ہیں۔ لیکن یہ مشکلات اسی وقت تک ہیں، جس وقت تک ملک کی حکومت آپ کی پشت پناہی نہ کرے اور خود بھی اپنی خارجی تجارت میں سود سے بچنے کی جدوجہد نہ کرے۔ لیکن اگر حکومت مختلف ممالک سے غیر سودی بنیادوں پر معاہدے کرنے کی کوشش کرے، اپنے ملک کے اندر بھی غیر سودی مالی نظام قائم کرے اور بیرونی ممالک میں اپنے تاجروں کی ادائیگیوں میں بھی مدد دے تو تمام مشکلات کا حل بآسانی نکالا جا سکتا ہے۔

سوال۔ کیا ایک اسلامی حکومت غیر ملکی سرمائے کو سود پر ملک میں لگانے کی اجازت دے سکتی ہے؟ اجازت نہ دینے کی صورت میں ملک کی صنعتی ترقی رک نہیں جائے گی؟

جواب۔ اسلامی حکومت میں کسی مسلم یا غیر مسلم، کسی ملکی یا غیر ملکی سرمایہ دار کو سودی کاروبار کی قطعاً اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اگر ملک میں سود کو بند کر دیا جائے تو غیر ملکی سرمایہ خود بخود بھاگنا شروع کر دیگا۔ یہ چیز انشاء اللہ ہمارے حق میں مفید ہی ہوگی۔ ہمیں تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ کسی ملک نے غیر ملکی سرمائے کے بل پر ترقی کرنے کی کوشش کی ہو اور وہ الٹا مزید پھندوں میں مدت ہائے دراز تک نہ پھنس گیا ہو۔ ہمیں اپنے ملک ہی کے سرمائے سے تجارتی اور صنعتی نشوونما کی جدوجہد کرنی چاہیے۔

سوال۔ کیا اسلام میں زکوٰۃ وصول کرنے کے ساتھ ساتھ انکم ٹیکس عائد کرنا بھی جائز ہے؟

جواب۔ جی ہاں! اسلامی ریاست میں یہ دونوں چیزیں جائز ہو سکتی ہیں۔ زکوٰۃ کے مصارف بالکل متعین ہیں جو کہ سورۂ کہف میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح اس کا نصاب۔ اور اس کی شرح بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرما دی ہے۔ ان امور میں کوئی ترمیم و تنسیخ جائز نہیں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ریاست کو اگر دوسری مزید ضروریات درپیش ہوں تو ان کے لیے وہ قوم سے مالی مدد حاصل کر سکتی ہے۔ اگر یہ وصولی جبری ہو تو ٹیکس ہے، اگر رضا کارانہ ہو تو چندہ ہے، اور واپسی کی شرط ہو تو LOAN قرضہ ہے۔ زکوٰۃ اور یہ دوسری قسم کی وصولیاں نہ ایک دوسرے کی جگہ لے سکتی ہیں اور نہ ایک دوسرے کو ساقط کر سکتی ہیں۔ یہ تو اس مسئلے کا اصولی جواب ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میں آپ کو یہ اطمینان بھی دلاتا ہوں کہ اگر ہمارے ملک میں ایک صحیح اسلامی حکومت قائم ہو جائے اور دیانت داری سے اس کا نظام چلایا جائے تو اتنے ٹیکسوں کی ضرورت باقی نہیں رہے گی جتنے آج موجود ہیں۔ موجودہ زمانے میں ٹیکسوں کے معاملے میں جتنی بدعنوانیاں اور بددیانتیاں ہوتی ہیں وہ آپ خوب جانتے ہیں۔ ایک طرف تو جس مقصد کے لیے ٹیکس لگایا جاتا ہے اس کا بمشکل دس فیصد اس مقصد کے لیے صرف ہوتا ہے۔ دوسری طرف ٹیکس سے بچنے EVASION کی ایک عام ذہنیت پیدا ہو گئی ہے۔ اگر نظام درست ہو جائے تو موجودہ ٹیکسوں کا ایک چوتھائی حصہ بھی کفایت کرے گا اور افادیت چار پانچ گنا زیادہ ہو جائے گی۔

سوال۔ لوگوں میں یہ احساس عام ہے کہ اسلام کے اصول و احکام پسندیدہ اور مستحسن تو ہیں مگر بحالات موجودہ قابل عمل نہیں ہیں۔ عوام و خواص میں اسلام سے جذباتی وابستگی تو ضرور ہے لیکن اسلام کا صحیح مفہوم اور آمادگیٔ عمل بہت کم ہے۔ اسلام جس ذہنی و عملی انضباط کا مطالبہ کرتا ہے اسے دیکھ کر یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی قوانین کو نافذ کر دیا گیا تو کہیں اس کے خلاف شدید رد عمل نہ رونما ہو جائے۔ سیاسی انقلاب سے پہلے سماجی انقلاب ضروری ہے اور اصلاح کا جذبہ اوپر سے اور باہر سے پیدا کرنے کے بجائے اندر سے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ صورت حال پیدا ہونے سے پہلے کیا اسلامی ریاست کا مطالبہ قبل از وقت نہیں ہے؟

جواب - اس سے متعلق اگر پوری وضاحت کی جائے تو اس کے لیے بڑے تفصیلی جواب کی ضرورت ہے لیکن میں اختصار کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ بلاشبہ سیاسی انقلاب سے پہلے ایک تمدنی، اجتماعی اور اخلاقی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی اسلامی انقلاب کا فطری طریقہ ہے۔ بلاشبہ یہ بات بھی درست ہے کہ اسلام کے احکام و قوانین صرف اوپر سے ہی مسلط نہیں کیے جاسکتے بلکہ اندر سے اُن کے اتباع کا دلی جذبہ بھی پیدا کیا جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ پاکستان کے قیام کی شکل میں سیاسی انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ اب یہ سوال چھیڑنا بالکل بے کار ہے کہ معاشرتی انقلاب پہلے برپا کرنا چاہیے اور سیاسی انقلاب بعد میں۔ اب تو سوال یہ پیدا ہو گیا ہے کہ جب تک قوم میں ذہنی انقلاب واقع نہ ہو اُس وقت تک آیا ہم سیاسی اختیارات کو کافرانہ اصولوں کے مطابق استعمال کرتے رہیں یا ان اختیارات کو بھی اسلامی اصولوں کے مطابق کام میں لائیں۔ سیاسی اقتدار کا کوئی نہ کوئی مصرف اور مقصد بہر حال ہمیں متعین کرنا پڑے گا۔ حکومت کی مشینری کو اخلاقی انقلاب رونما ہوتے تک معطل بہر حال نہیں کیا جا سکتا۔ ایک قوم جو خدا اور اس کے رسُول کی حاکمیت اور بالادستی پر ایمان رکھتی ہو، اجتماعی اور قومی زندگی کی باگیں اُس کے اپنے ہاتھ میں ہوں، اپنا نظام حیات وہ خود تعمیر کرنے کے قابل ہو اور کوئی دوسری کافرانہ طاقت اُس پر کوئی کافرانہ نظام مسلط کرنے والی نہ ہو تو کیا اس قوم کے افراد کے لیے یہ جائز اور درست ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اخلاقی وعظ و نصیحت تو کرتے رہیں مگر اپنی ہیئت حاکمہ کو غیر اسلامی اصولوں کے مطابق کام کرنے کے لیے چھوڑ دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اس صورت حال کو گوارا کر لیں تو گو ہم انفرادی ارتداد کے مرتکب نہ ہوں، اجتماعی اور قومی حیثیت سے ہم ضرور ارتداد کے مرتکب ہوں گے۔

پھر اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ اجتماعی و اخلاقی انقلاب لانا چاہتے ہیں تو آپ کو غور کرنا پڑے گا کہ اس انقلاب کے ذرائع و وسائل کیا کیا ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان ذرائع میں تعلیم و تربیت، معاشرتی اصلاح، ذہنی اصلاح اور اسی قسم کی بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ انہی کے ساتھ ساتھ حکومت کے قانونی اور سیاسی ذرائع و وسائل ہیں۔ حکومت کی طاقت نہ صرف بجائے خود

ایک بڑا ذریعہ اصلاح ہے، بلکہ وہ دیگر ساری اصلاحی تدابیر کو زیادہ موثر، نتیجہ خیز اور ہمہ گیر بنانے کا بھی ذریعہ ہے اب آخر کیا وجہ ہے کہ اخلاقی انقلاب لانے کے لیے حکومت کے وسائل کو بھی استعمال نہ کیا جائے۔ ہمارے ووٹوں اور ہمارے ادا کردہ ٹیکسوں اور مالیوں کے بل پر ہی تو حکومت کا سارا نظام چل رہا ہے۔ آخر اس حماقت اور جہالت کا ارتکاب ہم کیوں کریں کہ ایک طرف انفرادی حیثیت سے ہم اسلام کے سماجی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کریں اور دوسری طرف قومی حیثیت میں ہم کفر و الحاد کی اشاعت کریں۔ ایک طرف ہم اخلاقی اصلاح کی کوشش کرتے رہیں اور دوسری طرف حکومت کے سارے ذرائع اخلاق کے بگاڑنے اور فسق و فجور پھیلانے میں لگے رہیں۔

سوال۔ اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کا کاٹ دینا ہے۔ آجکل روزانہ سینکڑوں چوریاں ہوتی ہیں تو کیا روزانہ سینکڑوں ہاتھ کاٹے جائیں گے؟

جواب۔ قطع ید اور اسلام کے دوسرے قوانین فوجداری کے بارے میں اگر میں اسلام کا نقطۂ نظر پوری وضاحت سے بیان کروں تو اس میں بڑا وقت لگے گا۔ میں اس موضوع پر اپنی کتاب "اسلامی قوانین اور پاکستان میں اُس کے نفاذ کی عملی تدابیر" میں تفصیلی بحث کر چکا ہوں۔ اس وقت میں صرف اتنی بات کہوں گا کہ اگر چور کے ہاتھ کاٹنے کا طریقہ آج ہی سے جاری کر دیا جائے تو انشاء اللہ چوری نہایت تھوڑے عرصے میں ختم ہو جائے گی اور سینکڑوں ہاتھوں کے کٹنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ ایک چور یہ امید رکھتا ہے کہ میں دس ہزار چرا لوں گا اور اگر پکڑا جاؤں گا تو کچھ مدت تک سرکاری روٹیاں کھا کر واپس آجاؤں گا اور اُس وقت بھی میرے پاس اچھا خاصا سرمایہ جمع ہو گا۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص دوبارہ، اولین موقع پاتے ہی پھر چوری کرے گا۔ اس طرح کے عادی مجرمین کی ہمارے ہاں کثرت ہے اور انہی کو جرائم سے باز رکھنا مشکل ترین مسئلہ ہے۔ لیکن اگر چور کو یہ معلوم ہو کہ ایک مرتبہ پکڑے جانے کے بعد ایک ہاتھ اور دوسری مرتبہ پکڑے جانے کے بعد دوسرا ہاتھ کٹ جائے گا تو وہ چوری کرنے پر بآسانی آمادہ نہ ہو گا۔ پھر جس چور کا ہاتھ ایک مرتبہ کٹ جائے گا وہ جہاں جائے گا اُس کا کٹا ہوا ہاتھ پکار پکار کر داستان حال بیان کرے گا اور موجودہ صورت حال باقی نہیں رہے گی جس میں کہ پیشہ ور چور اور ڈاکو مہذب انسانوں کے بھیس میں چاروں سو اپنے شکار تلاش

کرتے چھپتے ہیں اور کوئی انہیں پہچان بھی نہیں سکتا۔ میری قطعی رائے یہ ہے کہ موجودہ وقت میں چوری کے انسداد کے لیے اس قانون کے نفاذ کی شدید ضرورت ہے۔ تہذیب جدید کے بہت سے نقائص میں سے ایک نقص یہ بھی ہے کہ اس کی ساری ہمدردیاں مجرم کے ساتھ ہیں، اُس سوسائٹی کے ساتھ نہیں ہیں جس کے خلاف مجرم سرگرم کار ہے۔ مجرد یہ سننے پر کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا اس تہذیب کے فرزندوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن ہولناک جرائم کو معاشرے میں پروان چڑھتے دیکھ کر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ آخر میں مَیں یہ بھی عرض کروں گا کہ اسلام صرف چور کا ہاتھ ہی نہیں کاٹتا، بلکہ وہ زکوٰۃ و صدقات کا نظام بھی قائم کرتا ہے، ہر شخص کی بنیادی ضروریات بھی پوری کرتا ہے، وہ شہریوں کی اخلاقی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کرتا ہے، وہ لوگوں کو حلال اور جائز طریق پر کمانا اور خرچ کرنا بھی سکھاتا ہے۔ اس کے بعد اگر ایک شخص کی حلال کمائی کو کوئی دوسرا حرام طریقے سے چراتا ہے تو اُسے ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جاتی ہے۔

زکوٰۃ سے متعلق چند تصریحات

سوال۔ جماعت اسلامی کے بیت المال کی وساطت سے جس طرح زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم ہوتی ہے اس پر بعض اوقات دو اعتراض وارد کیے جاتے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقوم جماعتی کاموں پر خرچ کردی جاتی ہیں اور صاحب نصاب کارکنوں کو معاوضے اور تنخواہیں وغیرہ بھی اس مد میں سے دے دی جاتی ہیں، حالانکہ یہ زکوٰۃ کا کوئی صحیح مصرف نہیں ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ زکوٰۃ کی صحیح ادائیگی کے لیے تملیک لازمی شرط ہے یعنی جب تک زکوٰۃ دینے والا کسی مستحق شخص یا اشخاص کو زکوٰۃ کا کلیتہً مالک و متصرف نہ بنا دے اُس وقت تک صحیح معنوں میں زکوٰۃ ادا ہی نہیں ہوتی۔ چونکہ جماعت کے بیت المال میں زکوٰۃ دیتے وقت کسی متعین فرد کو زکوٰۃ نہیں دی جاتی، اس لیے یہ زکوٰۃ کی ادائیگی کی صحیح شکل نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ ان اعتراضات کی حقیقت کو واضح کیا جائے کہ یہ صحیح ہیں یا غلط اور مسئلہ تملیک کے علاوہ اس امر کی بھی وضاحت کی جائے کہ جماعتی کاموں میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے یا نہیں۔

جواب - زکوٰۃ کے مستحق ازروئے قرآن یہ ہیں: فقراء، مساکین، عاملین زکوٰۃ، مؤلفۃ القلوب، الرقاب (غلام، قیدی وغیرہ)، الغارمین (ناگہانی قرض یا خسارے کے زیر بار)، فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں)، اور ابن السبیل (مسافر) - جماعت اسلامی کے بیت المال میں زکوٰۃ کی جو رقوم آتی ہیں ان میں سے فقراء، مساکین اور غارمین کی مد کے تحت عام غیر مستطیع مسلمانوں کو بھی زکوٰۃ دی جاتی ہے اور فی سبیل اللہ کی مد میں سے جماعت کے مختلف مصارف میں بھی زکوٰۃ خرچ کی جاتی ہے۔ "فی سبیل اللہ" سے مراد عام طور پر قتال فی سبیل اللہ مراد لیا جاتا ہے اور اس کا مصرف یہ بتایا جاتا ہے کہ جن مجاہدین کے سازوسامان کا باقاعدہ انتظام نہ ہو، انہیں سامان جہاد کی فراہمی کے لیے اس مد میں سے زکوٰۃ دی جانی چاہیے۔ لیکن قرآن مجید، احادیث و آثار اور اقوال ائمہ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ فی سبیل اللہ کا مفہوم اتنا محدود اور مخصوص نہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا گیا ہے۔

قرآن مجید نے "فی سبیل اللہ" کی مد بیان کرتے وقت قتال کی قید نہیں لگائی، حالانکہ اس مفہوم کو بیان کرنے کے لیے دوسرے مقامات پر بالعموم جہاد فی سبیل اللہ، قتال فی سبیل اللہ وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں۔ دوسری طرف قرآن مجید میں جہاں صرف فی سبیل اللہ کا لفظ آیا ہے وہاں اس کے معنی کو عام رکھا گیا ہے اور اسے مطلقاً جہاد یا قتال کے لیے استعمال نہیں کیا گیا۔ اسی طرح قتال کے علاوہ اطاعت الٰہی کے بہت سے ایسے کام ہیں جن کے ساتھ فی سبیل اللہ کی صفت لگائی گئی ہے۔ احادیث میں سے جس حدیث سے بالخصوص یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد قتال فی سبیل اللہ ہے وہ ابوداؤد، احمد اور حاکم کی یہ حدیث ہے: لا تحل الصدقۃ لغنی الا لغاز فی سبیل اللہ او لعامل علیہا او لغارم ... الخ (صدقہ کسی غنی کے لیے جائز نہیں الا یہ کہ وہ اللہ کی راہ کا غازی ہو یا زکوٰۃ کے سلسلے میں کارکن ہو یا مقروض و غارم ہو)۔ اس حدیث سے بلاشبہ یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ غازی غنی کو زکوٰۃ دینا جائز ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ فی سبیل اللہ کی مد سے صرف مجاہدین بالسیف ہی حصہ پاسکتے ہیں۔ بعض دوسری احادیث ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مد میں سے حاجیوں کو زکوٰۃ کے اونٹوں سے استفادے کی اجازت دی ہے، چنانچہ اسی بنا پر فقہائے حنفیہ میں سے امام محمدؒ، امام ابو یوسفؒ اور حسنؒ

فی سبیل اللہ کی مد سے حاجیوں کے زاد و راحلہ کا انتظام جائز قرار دیتے ہیں۔ بلکہ کتاب الخراج کی ایک عبارت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام ابویوسف نے اس مد کا مصرف "اصلاح طرق مسلمین (سڑکوں کی مرمت) قرار دے کر اسے وسیع تر کر دیا ہے۔ اس مسلک کی تائید ایک صحابی کے قول سے بھی ہوتی ہے جو کتاب الاموال لابی عبید کے ص۵۸۹ پر منقول ہے اور وہ یہ ہے "عن انس بن مالک والحسن قالا ما اعطیت فی الجسور و الطرق فھی صدقۃ ماضیۃ وقال اسماعیل انما تجزی من الزکوٰۃ" (انسؓ بن مالک اور حسنؒ نے فرمایا کہ جو کچھ تو پلوں اور سڑکوں کے لیے دے وہ بھی صدقہ ہے اور اسماعیل نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ اس طرح زکوٰۃ ادا ہو جائے گی)۔ شامی جلد ۲ ص۲۵ میں طلبہ کو بھی فی سبیل اللہ میں شمار کیا گیا ہے، خواہ وہ صاحب نصاب ہوں۔ علامہ آلوسی حنفی اپنی تفسیر روح المعانی میں "فی سبیل اللہ" کی تفسیر میں حنفیہ کا مسلک نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں "قیل المراد طلبۃ العلم واقتصر علیہ فی الفتاوی الظہیریۃ وفسرہ فی البدائع بجمیع القرب، فیدخل فیہ کل من سعی فی طاعۃ اللہ تعالیٰ وسبیل الخیرات" (اس سے طالب علم بھی مراد لیے گئے ہیں۔ فتاویٰ ظہیریہ میں اس مد کو طلبہ تک ہی محدود کیا گیا ہے لیکن البدائع والصنائع میں اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اس میں اللہ سے قریب لانے والے سارے کام شامل ہیں۔ چنانچہ جو کوئی اللہ کی اطاعت اور بھلائی کے رستے میں دوڑ دھوپ کرے گا وہ اس میں داخل ہے"۔

احناف کے علاوہ دیگر مذاہب بھی اس مد کو مقاتلین تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اس میں وسعت کے قائل ہیں۔ چنانچہ ابن عربی مالکی "احکام القرآن" میں فی سبیل اللہ کی تعریف میں لکھتے ہیں "قال مالک سبل اللہ کثیر۔ احمد واسحاق قالا انہ الحج والذی یصح عندی من قولھما ان الحج من جملۃ السبیل مع الغزو"۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ سُبُل اللہ یعنی اللہ کے راستے بہت سے ہیں۔ احمد اور اسحاق نے فرمایا ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد حج ہے لیکن میرے نزدیک اُن کے قول کا صحیح مطلب یہ ہے کہ حج بھی جہاد کی طرح اللہ کے راستوں میں سے ایک راستہ ہے)۔

دیار ہند و پاکستان کے متعدد علماء نے بھی یہ تصریح کی ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد دین کے تحت ساری علمی و عملی سرگرمیاں ہیں۔ چنانچہ سیرت النبی جلد ۵ میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم فرماتے ہیں

« اکثر فقہاء نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد لیا ہے مگر یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اوپر آیت گزر چکی ہے لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۔ یہاں فی سبیل اللہ سے مراد بالاتفاق جہاد نہیں بلکہ ہر نیکی اور دین کا کام مراد ہے »۔ مولانا عبد الصمد رحمانی (امارت شرعیہ بہار) نے اپنی ایک تالیف کتاب "العشر والزکوٰۃ" کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے بھی فی سبیل اللہ کی مد میں ایسے لوگوں کو شمار کیا ہے جو دین کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ جماعت اسلامی کے اہل علم کا مسلک اس بارے میں اس جواب سے ظاہر ہوتا ہے جو مولانا مودودی نے مولانا اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے مشورے سے حکومت کے ایک سوالنامے کے جواب میں ترجمان میں دیا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ "فی سبیل اللہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے خواہ وہ تلوار سے ہو یا قلم و زبان سے یا ہاتھ پاؤں کی دوڑ دھوپ اور محنت سے۔ سلف کے نزدیک اس کا مفہوم ان مساعی تک محدود ہے جو دین کے قائم کرنے، اس کی اشاعت کرنے اور اسلامی ممالک کا دفاع کرنے کے لیے کی جائیں"۔

جماعت اسلامی کا مقصد وحید اقامت دین ہے اور جماعت پوری کوشش کرتی ہے کہ اس کے اور اس کے کارکنوں کی سرگرمیاں اسی مقصد کے لیے وقف رہیں۔ مخیر حضرات کا بھی یہ کام ہے کہ وہ اپنی جگہ پر اس امر کا اطمینان کرلیں کہ آیا اس جماعت کے متفرق اور متنوع مشاغل اقامت دین اور فی سبیل اللہ کی تعریف میں آتے ہیں یا نہیں۔ اگر انہیں یہ اطمینان حاصل ہو جائے تو وہ اپنی زکوٰۃ جماعت کے بیت المال میں جمع کرا سکتے ہیں اور اگر یہ اطمینان حاصل نہ ہو تو وہ مختار ہیں، جہاں چاہیں اپنی زکوٰۃ دیں۔

جو اعتراض تملیک کے سلسلے میں کیا جاتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک شخصی تملیک ادائے زکوٰۃ کے لیے شرط لازم نہیں ہے۔ عموماً لِلْفُقَرَاءِ کے لام کو لام تملیک قرار دے کر اس سے وجوب تملیک کے حق میں استدلال کیا جاتا ہے، مگر کلام عرب میں حرف لام انہی معنوں میں استعمال نہیں ہوتا، بلکہ یہ حرف کئی مرتبہ تملیک کے بجائے انتفاع کے معنی دیتا ہے مثلاً وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ (الآیہ)۔ پھر تملیک شخصی کی شرط کو اگر ضروری بھی سمجھا جائے تو یہ اسی صورت میں ممکن العمل ہے

جبکہ مسلمانوں کی کوئی ایسی ہیئتِ حاکمہ یا ہیئتِ اجتماعیہ موجود نہ ہو جو ساری زکوٰۃ کو وصول کرتی ہو۔ لیکن ایک اسلامی حکومت کے بیت المال میں جب زکوٰۃ اپنی مطلوب اور مشروع شکل میں ادا کی جاتی ہے تو ایسی صورت میں شخصی تملیک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اگر اجتماعی حیثیت میں زکوٰۃ کی وصولی کے بعد ایک اسلامی حکومت زکوٰۃ کو کسی ایسے اجتماعی مصرف میں لگا دے جس کا فائدہ بحیثیت مجموعی مستحقین کو پہنچے تو یہ بھی زکوٰۃ کی تقسیم کی ایک بالکل جائز شکل ہوگی۔ اسلامی حکومت کی عدم موجودگی میں اگر مسلمانوں کا کوئی دینی و ملی ادارہ اسی طرز پر زکوٰۃ کی اجتماعی تحصیل و تقسیم کا انتظام کرے تو شرعاً اس پر بھی کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جماعت اسلامی کے علاوہ اور بھی بہت سی جماعتیں اور ادارے بھی اپنی ہر طرح کی ضروریات پر زکوٰۃ کی رقوم اُسی طرح خرچ کرتے ہیں جس طرح جماعت اسلامی خرچ کرتی ہے۔ لیکن ان میں سے بعض کے نزدیک انفرادی تملیک شرط ہے۔ چنانچہ اس شرط کو پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ آنے پر پہلے اُسے ادارے کے نادار افراد کے سپرد کیا جاتا ہے اور پھر فوراً اُن سے لے کر اجتماعی فنڈ میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حیلہ ایک غیر ضروری اور خواہ مخواہ کا تکلف ہے اور اس میں تملیک کی صورت سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ لین دین پہلے سے طے شدہ اور بالکل نمائشی ہوتا ہے، دائمی اور حقیقی تملیک ہرگز مقصود نہیں ہوتی۔

یہاں ایک اور بات کو بھی صاف کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے سوالات سے گمان ہوتا ہے کہ آپ کے خیال میں زکوٰۃ ہر حالت میں اُسی کو دی جانی چاہیے جو صاحبِ نصاب نہ ہو۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے تو یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ قید فقیر و مسکین کے لیے تو ایک حد تک درست ہے لیکن دوسری مدات میں بھی اگر یہ شرط لازم ٹھہرا دی جائے تو پھر مزید چھ مدات کو الگ الگ رکھنے کے کوئی معنی باقی نہیں رہتے کیونکہ جو صاحبِ نصاب نہیں ہوگا وہ بہر حال فقراء و مساکین کے زمرے میں داخل ہو کر مستحقِ زکوٰۃ ہو ہی جائے گا۔ اس کے لیے کسی دوسری بنائے استحقاق کے ذکر کرنے یا ملحوظ رکھنے کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اگر ایک آدمی کو ایک سے زائد وجوہ زکوٰۃ کا حقدار بنا دیں تو بلاشبہ اُس کا حق فائق ہوگا لیکن یہ امر تو احادیث سے بصراحت ثابت ہے کہ فقر و مسکنت کے علاوہ دوسری

مخصوص صفات جس شخص کو مستحق زکوٰۃ بناتی ہیں وہ شخص صاحب نصاب اور غنی ہونے کے باوجود زکوٰۃ لے سکتا ہے۔اس سلسلے کی ایک حدیث اوپر نقل کی جاچکی ہے۔

آخر میں یہ امر بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ زکوٰۃ جماعت اسلامی کے بیت المال کا واحد ذریعۂ آمدنی نہیں ہے۔جماعت کی آمد کے متعدد ذرائع ہیں، ان میں کتب و رسائل کی آمدنی بھی ہے۔ارکان و متفقین کی خصوصی اعانتیں بھی ہیں اور عام اہل خیر کے عطیات بھی ہیں۔اس لیے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ جماعت کے بالمعاوضہ کارکن اپنی تنخواہیں زکوٰۃ سے لے رہے ہیں یا جماعت کے دوسرے سارے کام زکوٰۃ کے بل پر چل رہے ہیں۔اب تو بالفعل یہ صورت ہے کہ متعدد بڑے بڑے شہروں میں خیراتی شفاخانے قائم ہیں اور زکوٰۃ و صدقات زیادہ تر ان پر صرف ہو رہے ہیں۔بیت المال میں اگر زکوٰۃ آتی ہے تو اس کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا ہے اور اعانت فقراء و مساکین پر جو کچھ خرچ ہوتا ہے اس کا بھی الگ حساب رکھا جاتا ہے۔جماعت کے دیگر مصارف اتنے زیادہ ہیں کہ زکوٰۃ کی بقیہ رقم اگر ان میں خرچ ہو، تب بھی وہ ان مصارف کا ایک معمولی جزو بنتی ہے، اس لیے اس امر کا کوئی خدشہ باقی نہیں رہتا کہ زکوٰۃ اپنے صحیح مصرف میں خرچ نہ ہو۔

منصب تجدید اور وحی و کشف

سوال۔رسالہ ترجمان القرآن بابت ماہ جنوری و فروری ۱۹۵۱ء کے صفحہ ۲۲۶ پر ایک سوال کے جواب کے دوران میں تحریر فرمایا گیا ہے کہ:

"پچھلے زمانہ کے بعض بزرگوں نے بلاشبہ اپنے متعلق کشف و الہام کے طریقہ سے خبر دی ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے مجدد ہیں۔لیکن انہوں نے اس معنیٰ میں کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ ان کو مجدد تسلیم کرنا ضروری ہے اور جو ان کو نہ مانے وہ گمراہ ہے۔"

یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے "تفہیمات الٰہیہ" میں بڑے زور کے ساتھ یہ دعویٰ فرمایا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے مطلع فرمایا ہے کہ تو اس زمانہ کا

امام ہے - چاہیے کہ لوگ تیری پیروی کو ذریعۂ نجات سمجھیں۔ شاہ صاحب کی کتاب ”تفہیمات“ کا اصل حوالہ مع ترجمہ درج ذیل ہے :-

قد منّ الله سبحانه عليّ وعلى اهل زماني بان منحني طريقا من السلوك هي اقرب الطرق وهي مركبة من خمس اقربات اعني الايمان الحقيقيّ وقرب النوافل وقرب الوجوب وقرب الفرائض وقرب الملكوت وجعل هذه الطريقة غاية من ارادها ناله الله تعالى- فهمني ربي جل جلاله انا جعلناك امام هذه الطريقة و اوصلناك ذروة سنامها وسددنا طرق الوصول الى الحقيقة القرب كلها اليوم غير طريقة واحدة و هو محبتك والانقياد لك فالسماء ليس على من عاداك بسماء وليست الارض عليه بارض فاهل المغرب واهل المشرق كلهم رعيتك و انت سلطانهم علموا او لم يعلموا فان علموا فازوا وان جهلوا

اللہ تعالیٰ نے مجھ اور میرے زمانے کے لوگوں پر یہ احسان کیا کہ اس نے مجھے ایک ایسا طریقہ سلوک عطا کیا ہے کہ جو سب طریقوں سے قریب ہے اور اس میں پانچ قسم کے قرب کے ذریعے ہیں۔ یعنی ایک تو ایمان حقیقی کا، دوسرا قرب نوافل، تیسرا قرب وجوب، چوتھا قرب فرائض اور پانچواں قرب ملکوت۔ اور اس کو ایسا عمدہ غایت بنایا ہے کہ جو کوئی اس کا ارادہ کرے گا وہ مراد کو پہنچے گا۔ اور میرے رب نے مجھے مطلع فرمایا ہے کہ ہم نے تجھے اس طریقہ کا امام مقرر کیا ہے اور اس کی اعلیٰ بلندی پر پہنچا دیا ہے اور ہم نے آج کے روز سے باقی سب طریقوں کو حقیقتِ قرب تک پہنچنے سے مسدود کر دیا ہے بجز اس طریقے کے جو تجھے دیا گیا اور وہ ایک ہی طریقہ ہے جو کھلا رکھا گیا۔ لوگوں کو چاہیے کہ تجھ سے محبت کریں اور تیری فرمانبرداری کو ذریعۂ نجات سمجھیں۔ اور اب آسمانی برکات اس شخص پر نہیں ہوں گی جو تیرے ساتھ عداوت اور بغض رکھے گا اور نہ وہ ارضی برکات کا مورد ہوگا اور مغرب اور

خَابُوا۔ مشرق کے لوگ تیری رعیت کر دیے گئے ہیں۔ اور تو ان کا بادشاہ مقرر کیا گیا ہے، خواہ وہ لوگ تیری حقیقت سے واقف ہوں یا نہ ہوں۔ اگر واقف ہونگے تو فائز المرام ہونگے اور اگر بے خبر رہیں گے تو خسارہ اور ٹوٹا پائیں گے۔

(عسل مصفیٰ۔ جلد اول ص ۱۶۲-۱۶۳)

کیا جناب شاہ صاحب کا یہ دعویٰ درست تھا یا نہیں؟ اگر ان کا دعویٰ درست تھا تو پھر "ترجمان" کی مذکورہ بالا عبارت درست نہیں ہے۔

اس عبارت کے بعد "ترجمان" میں لکھا گیا ہے کہ:

"دعویٰ کرکے اس کے ماننے کی دعوت دینا اور اسے منوانے کی کوشش کرنا سرے سے کسی مجدد کا منصب ہی نہیں۔"

نیز یہ کہ:۔

"جو شخص یہ حرکت کرتا ہے وہ خود اپنے اس فعل ہی سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ فی الواقع مجدد نہیں۔"

ان ارشادات کی بنیاد قرآن کریم ہے یا احادیث نبویہ، یا اپنے اجتہاد کی بنا پر یہ فتویٰ دیا گیا ہے؟

رسالہ مذکورہ کے اسی صفحہ پر فقرہ ۱۶ کے ماتحت لکھا گیا ہے کہ:۔

"کشف و الہام وحی کی طرح کوئی یقینی چیز نہیں۔ اس میں وہ کیفیت نہیں ہوتی کہ صاحب کشف و الہام کو آفتاب روشن کی طرح یہ معلوم ہو کہ یہ کشف و الہام خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو رہا ہے۔"

اگر امت محمدیہ کے کاملین کے الہام و کشوف کی یہ حقیقت ہے تو پھر ان کے خیر امت ہونے کی حالت معلوم شد۔ حالانکہ پہلی امتوں میں عورتیں وحی یقینی سے مشرف ہوتی رہی ہیں۔ اور خدا کے ایسے بندے بھی ہوتے رہے ہیں کہ جن کے کشف و الہام کا یہ عالم تھا کہ ایک اولوالعزم نبی

تو بھی سوال کر کے ندامت اٹھانی پڑی۔

مگر سبحان اللہ! امتِ محمدیہ کے کاملین کے کشوف و الہام عجیب قسم کے تھے کہ ان کو خود بھی یقین نہ تھا کہ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں یا نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کو ان کو اس قسم کے الہامات و کشوف دکھانے کی ضرورت کیا پڑ گئی جن سے نہ کوئی دینی فائدہ مقصود تھا اور نہ ہی صاحبِ کشف و الہام کے لیے وہ موجبِ ازدیادِ ایمان۔ بلکہ الٹا موجبِ تردد ہونے کے سبب ایک قسم کی مصیبت تھے۔

جواب۔ آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے وحی و الہام کے مختلف مفہومات کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ ایک قسم کی وحی وہ ہے جسے وحی جبلی یا طبیعی کہا جا سکتا ہے، جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ہر مخلوق کو اس کے کرنے کا کام سکھاتا ہے۔ یہ وحی انسانوں سے بڑھ کر جانوروں پر اور شاید ان سے بھی بڑھ کر نباتات و جمادات پر ہوتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جسے وحی جزئی کہا جا سکتا ہے، جس کے ذریعے کسی خاص موقع پر اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو امورِ زندگی میں سے کسی امر کے متعلق کوئی علم، یا کوئی ہدایت دیتا ہے یا کوئی تدبیر سجھا دیتا ہے۔ یہ وحی آئے دن عام انسانوں پر ہوتی رہتی ہے۔ دنیا میں بڑی بڑی ایجادیں اسی وحی کی بدولت ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے اہم علمی انکشافات اسی وحی کے ذریعے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے اہم تاریخی واقعات میں اسی وحی کی کارفرمائی نظر آتی ہے —— جبکہ کسی شخص کو کسی اہم موقع پر کوئی خاص تدبیر بلا غور و فکر اچانک سوجھ گئی اور اس نے تاریخ کی رفتار پر ایک فیصلہ کن اثر ڈال دیا۔ ایسی ہی وحی حضرت موسیٰ کی والدہ پر بھی ہوئی تھی۔ ان دونوں قسم کی وحیوں سے بالکل مختلف نوعیت کی وحی وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو حقائقِ غیبیہ پر مطلع فرماتا ہے اور اسے نظامِ زندگی کے متعلق ہدایت بخشتا ہے تاکہ وہ اس علم اور اس ہدایت کو عام انسانوں تک پہنچائے اور انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائے۔ یہ وحی انبیاء کے لیے خاص ہے۔ قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نوعیت کا علم، خواہ اس کا نام القاء رکھیے، الہام رکھیے، کشف رکھیے، یا اصطلاحاً اسے وحی سے تعبیر کیجیے، انبیاء و رسل کے سوا کسی کو نہیں دیا جاتا۔ اور یہ علم صرف انبیاء ہی کو اس

طور پر دیا جاتا ہے کہ انہیں اس کے من جانب اللہ ہونے، اور شیطان کی دراندازی سے بالکل محفوظ ہونے اور خود اپنے ذاتی خیالات، تصورات اور خواہشات کی آلائشوں سے بھی پاک ہونے کا پورا یقین ہوتا ہے نیز یہی علم حجت شرعی ہے، اس کی پابندی ہر انسان پر فرض ہے اور اس کو دوسرے انسانوں تک پہنچانے اور اس پر ایمان کی دعوت سب بندگان خدا کو دینے پر انبیاء علیہم السلام مامور ہوتے ہیں۔ اور پھر یہی وہ وحی ہے کہ جس پر ایمان لانا لازمۂ نجات اور جس سے روگردانی کرنا قطعی طور پر موجب خسران ہوتا ہے۔

انبیاء کے سوا دوسرے انسانوں کو اگر اس تیسری قسم کے علم کا کوئی جز نصیب بھی ہوتا ہے تو وہ ایسے دھندلے اشارے کی حد تک ہوتا ہے جسے ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے وحی نبوت کی روشنی سے مدد لینا (یعنی کتاب و سنت پر پیش کر کے اس کی صحت و عدم صحت کو جانچنا اور بصورت صحت اس کا منشا متعین کرنا) ضروری ہے۔ جو شخص اپنے الہام کو ایک مستقل بالذات ذریعۂ ہدایت سمجھے اور وحی نبوت کی کسوٹی پر اس کو پرکھے بغیر اس پر خود عمل کرے اور دوسروں کو اس کی پیروی کی دعوت دے، اس کے ایسے طرز عمل کو از روئے شریعت کوئی سند جواز نہیں دی جا سکتی۔ قرآن میں اس حقیقت کو متعدد مقامات پر صاف صاف بیان کیا گیا ہے، خصوصاً سورۂ جن کی آخری آیات میں تو اسے بالکل ہی کھول کر فرما دیا گیا ہے کہ عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَ اَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا۔

اگر ہم غور کریں تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ امت کے صالح و مصلح آدمیوں کو نبی کا سا کشف و الہام نہ دینے اور اس سے کمتر ایک طرح کا تابعانہ کشف و الہام دینے میں کیا مصلحت ہے۔ پہلی چیز عطا نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہی چیز نبی اور امتی کے درمیان بنائے فرق ہے، اسے دور کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسری چیز دینے کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ نبی کے بعد اس کے کام کو جاری رکھنے کی کوشش کریں وہ اس بات کے محتاج ہوتے ہیں کہ دین میں ان کو حکیمانہ بصیرت اور اقامت دین کی سعی میں ان کو صحیح رہنمائی اللہ کی طرف سے حاصل ہو۔ یہ چیز غیر شعوری طور پر تو ہر مخلص اور صحیح الفکر

خادمِ دین کو بخشی جاتی ہے، لیکن اگر کسی کو شعوری طور پر بھی دے دی جائے تو یہ اللہ کا انعام ہے۔

قرآن کی رُو سے یہ حیثیت صرف ایک نبی ہی کو حاصل ہوتی ہے کہ وہ امرِ تشریعی سے مامور من اللہ ہوتا ہے اور خلق کو یہ دعوت دینے کا مجاز ہوتا ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کی اطاعت کریں، حتیٰ کہ جو اس پر ایمان نہ لائے وہ خدا کو ماننے کے باوجود کافر ہوتا ہے۔ یہ حیثیت نبی کے سوا کسی کو بھی نظامِ دین میں حاصل نہیں ہے۔ اگر کوئی اس حیثیت کا مدعی ہو تو ثبوت اُسے پیش کرنا چاہیے نہ کہ ہم اس کے دعویٰ کی نفی کا ثبوت پیش کریں۔ وہ بتلائے کہ قرآن و حدیث میں کہاں نبی کے سوا کسی کا یہ منصب مقرر کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے اُس منصب پر مامور کیے جانے کا دعوے کرے اور اپنے اس دعوے کو ماننے کی لوگوں کو دعوت دے اور جو اس کا دعویٰ تسلیم نہ کرے وہ مجرد اس بناء پر کافر اور جہنمی ہو کہ اُس نے مدعی کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کیا؟

اگر کوئی شخص حدیث "من یجدد لہا دینہا" کا حوالہ دے، یا ان احادیث کو پیش کرے جو مہدی کی آمد کے متعلق ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان میں کہیں بھی مجدد یا مہدی کے منصب کی وہ حیثیت بیان نہیں کی گئی ہے جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔ آخر ان میں کہاں یہ لکھا ہے کہ یہ لوگ اپنے مجدد اور مہدی ہونے کا دعویٰ کریں گے، اور جو ان کے دعوے کو مانے گا وہی مسلمان رہے گا، باقی سب کافر ہو جائیں گے؟

یہاں یہ بحث چھیڑنا بھی غلط مبحث ہے کہ جو شخص تجدید و احیاءِ دین اور اقامتِ دین کا برحق کام کر رہا ہو اس کا ساتھ نہ دینا یا اس کی مخالفت کرنا کس طرح موجبِ نجات ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس طرح کا کام جہاں اور جب بھی ہوتا ہے وہ فارق بین الحق والباطل بن جاتا ہے اور آدمی کے حق پرست ہونے کی پہچان یہی ہوتی ہے کہ وہ ایسے کام کا ساتھ دے۔ لیکن اس فرق و امتیاز کی بنیاد دراصل یہ ہوتی ہے کہ دین کی تجدید و اقامت میں سعی کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے، نہ یہ کہ کسی مدعی کے دعوے کو ماننا ایمان کا تقاضا ہوتا ہے اور مجرد اس بنا پر ایک مسلمان نجات سے محروم ہو جاتا ہے کہ اس نے ایک شخص کے دعوائے مجددیت یا مہدویت کو نہیں مانا۔

اب شاہ ولی اللہ صاحب اور مجدد سرہندی رحمہما اللہ کے دعووں کو لیجیے۔ ان دونوں بزرگوں کے تجدیدی اور اصلاحی کارناموں کے اعتراف کے باوجود یہ کہے بغیر چارہ نہیں ہے کہ ان کا اپنے مجدد ہونے کی خود تصریح کرنا اور بار بار کشف و الہام کے حوالہ سے اپنی باتوں کو پیش کرنا اُن کے شایانِ شان نہ تھا۔ اُن کے اسی اِدّعا نے بعد کے بہت سے کم ظرفوں کو طرح طرح کے دعوے کرنے اور امت میں نت نئے فتنے اٹھانے کی جرأت دلائی۔ کوئی شخص اگر تجدید کے لیے کسی قسم کی خدمت انجام دینے کی توفیق پاتا ہو تو اسے چاہیے کہ خدمت انجام دے اور یہ فیصلہ اللہ پر چھوڑ دے کہ اس کا کیا مقام اس کے ہاں قرار پاتا ہے۔ آدمی کا اصل مقام وہ ہے جو آخرت میں اس کی نیت و عمل کو دیکھ کر اور اپنے فضل سے اس کو قبول کر کے اللہ تعالیٰ اسے دے، نہ کہ وہ جس کا وہ خود دعویٰ کرے یا لوگ اسے دیں۔ اپنے لیے خود القاب و خطابات تجویز کرنا اور دعووں کے ساتھ انہیں بیان کرنا اور اپنے مقامات کا ذکر زبان پر لانا کوئی اچھا کام نہیں ہے۔ بعد کے ادوار میں صوفیانہ ذوق نے تو اسے اتنا گوارا کیا کہ خوشگوار بنا دیا۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے لوگوں کو بھی اس فعل میں کوئی قباحت محسوس نہ ہوئی، مگر صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین و ائمہ مجتہدین کے دور میں یہ چیز بالکل ناپید نظر آتی ہے۔

ہم شاہ صاحب اور مجدد صاحب کے کام کی بے حد قدر کرتے ہیں، اور ہمارے دل میں ان کی عزت ان کے کسی معتقد سے کم نہیں ہے، مگر ان کے جن کاموں پر ہمیں کبھی شرح صدر حاصل نہیں ہوا ان میں سے ایک یہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ان کی کسی بات کو بھی اس بنا پر کبھی نہیں مانا کہ وہ اسے کشف یا الہام کی بنا پر فرما رہے ہیں، بلکہ جو بات بھی مانی ہے اس وجہ سے مانی ہے کہ اس کی دلیل مضبوط ہے، یا بات بجائے خود معقول و منقول کے لحاظ سے درست معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم نے جو اُن کو مجدد مانا ہے تو یہ ایک رائے ہے جو ان کا کام دیکھ کر ہم نے قائم کی ہے، نہ کہ ایک عقیدہ ہے جو ان کے دعووں کی بنا پر اختیار کر لیا گیا ہے۔

چند متفرق سوالات

سوال (۱) قرآن کریم میں "حق" کی اصطلاح کن کن معنی میں استعمال ہوئی ہے؟ اور وہ معنی ان مختلف آیات پر کس طرح چسپاں کیے جا سکتے ہیں جو تخلیق کائنات بالحق، کتاب بالحق، رسالت بالحق اور یحق الحق و یبطل الباطل کے تحت حق کی ہم آہنگی، تسلسل اور ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہیں؟

(۲) قرآن کریم میں کتاب کے ساتھ میزان اتارنے کا جو دعویٰ کیا گیا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ الہامی قانون کے ساتھ وہ کونسی ترازو اتاری گئی ہے جس پر ہم اپنی سوسائٹی کے جواہر اور سنگریزوں کے وزن اور قیمت کا اندازہ کر سکیں۔ مفسرین کا یہ کہنا کہ انسانیت کے اخلاقی اعتدال کا نام میزان ہے، درست نہیں ہو سکتا۔ اول تو شخصی ضمیر کے اخلاقی احساسات سچائیوں کا صحیح وزن و قیمت متعین نہیں کر سکتے، دوسرے یہ کہ میزان کے ساتھ کتاب اتاری گئی ہے اور انسانی ضمیر کی میزان پیغمبروں اور کتابوں کے ساتھ نہیں اتاری جا سکتی وہ پہلے بھی تھی اور بعد کو بھی رہے گی۔

(۳) مذاہب کا پروگرام اگر انسانی فطرت کے لیے کشش رکھتا تھا تو متقی لوگوں نے کسی بھی ملک و قوم میں بہتر سوسائٹی بنانے میں کیوں کامیابی حاصل نہیں کی۔ اگر انسانیت کی پوری تاریخ میں بھی مذہب کامیاب نہ ہو سکا تو آج کیونکر اس سے امن و ترقی کی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں! یہ کہہ دینا کہ انسانی فطرت ہی میں خرابی مضمر تھی مفید نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر انسانی فطرت ہی اصلاح طلب نہ تھی تو پھر مذاہب حق کو زندہ کرنے اور باطل کو مٹانے کے لیے کام کرتے رہے مگر نتیجہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے علاوہ ہمیشہ الٹا ہی نکلا اور تاریخ کے سیلاب کا رخ یا بالفاظ دیگر تبدیلیاں کی طاقت شکست نہ کی جا سکی؟

(۴) پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ کیوں بند ہو گیا؟ کیا انسانی شعور کو آج ان کی ضرورت باقی نہیں رہی؟

جواب: (۱) حق کا لفظ قرآن مجید میں تین معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں وہ حقیقت (REALITY) کے معنی میں آیا ہے۔ کہیں استحقاق (RIGHT) کے معنی میں اور کہیں مقصدیت (PURPOSIVENESS) کے معنی میں ہے۔

تخلیق کائنات کے سلسلہ میں جہاں کہیں یہ ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے زمین و آسمان کو بالحق پیدا کیا ہے، اس سے مقصود ایک طرف تو یہ بتانا ہوتا ہے کہ یہ کائنات محض کھیل کے طور پر بے مقصد نہیں بنائی گئی ہے کہ کچھ مدت اس سے دل بہلا کر اسے یونہی بے نتیجہ ختم کر دیا جائے اور دوسری طرف یہ بتانا بھی پیش نظر ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے ہنگامے بے حقیقت نہیں ہیں، جیسا کہ بعض فلسفیوں اور مذہبی گیانیوں کا تصور ہے، بلکہ یہ ایک سنجیدہ حقیقت ہے جس کے کسی پہلو کو محض کھیل نہیں سمجھنا چاہیے۔ نیز بعض مقامات پر اس ارشاد سے یہ بتانا بھی مقصود ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کا سارا نظام "حق" پر مبنی ہے جس میں باطل کے لیے کوئی ثبات اور وزن نہیں ہے۔

(۲) "میزان" سے مراد صرف وہ توازنِ ذہنی اور وہ جانچنے اور تولنے کی صلاحیت اور صحیح و غلط کا موازنہ کرنے کی قوت ہے جو صرف انبیاء علیہم السلام اور کتابِ الٰہی اور طریقۂ انبیاء سے حکمت و ہدایت اخذ کرنے والوں میں پیدا ہوتی ہے۔ محض پیدائشی اعتدالِ فکر یا فلسفیانہ غور و خوض اور لادینی اخلاقی تعلیمات سے بظاہر جو توازن پیدا ہوتا ہے وہ حقیقی توازن نہیں ہوتا، بلکہ اس میں بہت افراط و تفریط باقی رہ جاتی ہے۔ یہ چیز صرف ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو آیاتِ الٰہی میں تدبر کرتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں کا غائر مطالعہ کر کے ان سے علم کی روشنی اور حکیمانہ بصیرت حاصل کرتے ہیں۔

(۳) آپ کا یہ سوال جتنے مختصر لفظوں میں ہے، اتنے مختصر لفظوں میں اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم اگر محض اشارات سے آپ کی تشفی ہو سکے تو جواب یہ ہے کہ اول تو آپ لفظِ مذہب کے نام سے جس چیز کو مراد لیتے ہیں اس کا تعین کریں۔ اگر مذہب کا لفظ آپ جنس کے طور پر استعمال کر رہے ہیں جس میں ہر قسم کے مذاہب شامل ہیں تو اس کی طرف سے جواب دہی کرنا میرا کام نہیں ہے اور اگر مذہب سے آپ کی مراد دینِ حق، یعنی وہ دین ہے جس کی تعلیم ابتدائے آفرینش سے انسان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی رہی ہے اور جس کا نام عربی زبان میں اسلام ہے تو وہ مجموعہ ہے ان اصولوں کا جو کائنات کی واقعی حقیقتوں پر مبنی ہیں اور بجائے

خود صحیح ہیں، خواہ انسان ان کو مانے یا نہ مانے۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے مثلاً حفظانِ صحت کے اصول ہیں کہ وہ انسان کے جسم کی ساخت اور اس کے اعضا کی حقیقی فعلیت اور اس کے طبیعی ماحول کی واقعی حقیقتوں پر مبنی ہیں۔ ان اصولوں کے مطابق کھانا، پینا، سانس لینا، آرام کرنا وغیرہ لازمی طور پر انسان کو تندرست رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص یا ساری دنیا مل کر بھی ان اصولوں کی خلاف ورزی کریں تو نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حفظانِ صحت کے اصول باطل ہیں، نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی پابندی کرنا انسانی فطرت کا تقاضا نہیں ہے، نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اصول ٹوٹ گئے اور شکست کھا گئے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانوں کی اس خلاف ورزی نے اِن اصولوں کا کوئی نقصان کیا ہے، بلکہ درحقیقت اگر انسان ان اصولوں کے خلاف چلتے ہیں تو یہ ان کی ناکامی ہے اور نقصان ان کا اپنا ہے، نہ کہ ان اصولوں کا۔ پس آپ جس چیز کو مذہب کی ناکامی کہہ رہے ہیں، وہ مذہب کی ناکامی نہیں، انسانوں کی ناکامی ہے۔ مثال کے طور پر مذہب ہم کو امانت کی تعلیم دیتا ہے، اب اگر تمام دنیا کے انسان مل کر بھی خیانت شروع کر دیں اور امانتوں کو ضائع کرنے لگیں تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ مذہب ناکام ہوا؟ مذہب کی ناکامی تو اس صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ یا تو یہ ثابت ہو جائے کہ فطرتِ کائنات اور فطرتِ انسان امانت کی نہیں، خیانت کی مقتضی ہے، یا یہ ثابت ہو جائے کہ انسانی زندگی کا حقیقی امن اور تمدنِ انسانی کا قابلِ اعتماد استقلال اور تہذیب کا تسلسل ارتقاء امانت سے نہیں، بلکہ خیانت سے قائم ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ ثابت نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا تو انسانوں کا امانت چھوڑ کر خیانت کو اختیار کرنا اور اس سے اخلاقی، روحانی اور تمدنی نقصانات اٹھانا انسانوں کی ناکامی کا ثبوت ہے، نہ کہ "مذہب" یا دین کی ناکامی کا۔ اسی طرح اور جتنے اصول "دین" نے پیش کیے ہیں یا بالفاظِ دیگر جن اصولوں کے مجموعے کا نام "دینِ حق" ہے ان کو جانچ کر دیکھیے کہ وہ حق ہیں یا نہیں؟ اگر وہ حق ہیں تو ان کی کامیابی و ناکامی کا فیصلہ اس بنا پر نہ کیجیے کہ انسانوں نے ان کی پابندی کی ہے یا نہیں؟ انسانوں نے جب ان کی پیروی کی تو وہ خود کامیاب ہوئے اور اگر ان کی پیروی نہ کی تو وہ خود ناکام ہوئے۔

(۴) جو لوگ ختم نبوت کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ انسانی شعور کو اس کی ضرورت نہیں رہی تو وہ دراصل سلسلۂ نبوت کی توہین اور اس پر حملہ کرتے ہیں۔ اس تعبیر کے معنی یہ ہیں کہ صرف ایک خاص شعوری حالت تک ہی اس ہدایت کی ضرورت ہے جو نبی لاتے ہیں۔ اس کے بعد انسان نبوت کی رہنمائی سے بے نیاز ہو گیا ہے۔

جب تک انسانی تمدن اس حد پر نہیں پہنچا تھا کہ کسی نبی کا پیغام عام ہو سکے اور انسانوں کی کوئی ایسی امت تیار نہ ہو سکی تھی کہ نبی کے پیغام اور اس کی تعلیم اور اس کے اُسوہ کو محفوظ رکھ سکے اور دنیا کے گوشے گوشے میں اسے پھیلا سکے، اس وقت تک سلسلۂ نبوت جاری رہا اور مختلف قوموں اور ملکوں میں نبی بھیجے جاتے رہے، مگر جب ایک طرف تو تمدن اس حد تک ترقی کر گیا کہ ایک نبی کا پیغام عالمگیر ہو سکتا تھا اور دوسری طرف ہدایت حق قبول کرنے والوں کی ایک ایسی امت بھی بن گئی جو کتاب الٰہی کو اور کتاب کے لانے والے کی سیرت اور اس کی مکمل عملی رہنمائی کو جُوں کی توں محفوظ رکھنے کے قابل تھی تو نبوت کی خدمت پر کسی مزید آدمی کو مامور کرنے کی حاجت باقی نہ رہی۔

اسلامی نظام معیشت میں منصوبہ بندی

سوال: جماعت اسلامی کی تحریروں کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ اسلام وسائل پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کے خلاف ہے۔ اگر یہ درست ہے تو پھر مسابقت کے اس دور میں جب اشیاء نہایت ہی سرعت کے ساتھ پیدا کی جا رہی ہیں، قومی پیداوار کو ایک منصوبہ کے تحت ترقی دینے میں آپ کیا تدابیر اختیار کریں گے؟

جواب: آپ کا یہ سوال ایک طویل بحث کا متقاضی ہے۔ فی الحال صرف اسی قدر سمجھ لیجیے کہ منصوبہ بندی اور 'REGIMENTATION' میں ایک نمایاں فرق ہے۔ اسلام جس چیز کا مخالف ہے وہ REGIMENTATION ہے، منصوبہ بندی نہیں۔

معلوم نہیں لوگوں نے یہ بات کیونکر فرض کر لی ہے کہ کوئی منصوبہ وسائل پیداوار کو حکومت کی

(باقی صہ ۴۳۲ پر)

تعارفِ کتب

(عبد الحمید)

راہنمائے فسقِ جدید (A GUIDE TO MODERN WICKEDNESS) تالیف پروفیسر سی۔ای۔ایم جوڈ۔ مطبوعہ فیبر اینڈ لمیٹڈ رسل سٹریٹ لندن۔ صفحات ۲۹۱۔

پروفیسر جوڈ مشرق ومغرب کے علمی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اُس نے اگرچہ دنیا کے سامنے کوئی نیا فکر پیش نہیں کیا مگر رائج الوقت افکار کی جس خوبی اور ذہانت کے ساتھ تشریح و تنقیح کی ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔ اُس کا دماغ شروع سے آخر تک انسان اور اس کے متعلقہ مسائل کو سوچنے میں مصروف رہا۔ اس کے فکر ونگاہ کے زاویوں میں کئی تغیرات پیدا ہوئے۔ اُس نے مسیحیت کو خیرباد کہہ کر دہریت اور مادیت کو اختیار کیا مگر یہاں بھی اطمینان نصیب نہ ہو سکا اور آخر کار پھر مذہب کی آغوش میں پناہ لینا پڑی۔

زیرِ نظر کتاب اُس کے اس آخری دور کی ترجمان ہے۔ اس کا آغاز اس حقیقت سے کیا گیا ہے کہ دنیائے اخلاق میں چند ایسی مستقل اور پائیدار اقدار ہیں جو زمان ومکان کی تبدیلی کے ساتھ نہیں بدلتیں۔ مارکسی طرزِ فکر نے ان معروضی قدروں کی نفی کر کے انسانیت کو ایک عظیم نقصان پہنچایا ہے۔ اب ہر فرد اور گروہ کے نزدیک نیکی وہ ہے جس سے اُسے مادی فائدہ حاصل ہو سکے، اور برائی وہ جس کے اختیار کرنے سے اُسے دنیاوی فوائد ولذائذ سے محروم ہونا پڑے۔ اخلاق کی معروضی اقدار کے ثبوت میں اُس نے ایک دلیل بھی دی ہے وہ لکھتا ہے:۔

"فرض کیجیے آپ کے پاس کوئی شخص آکر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ کونین مفید ہے۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیوں مفید ہے؟ جواب ہے یہ بخار کو اتارتی ہے لیکن اگر ہم کیوں چاہتے ہیں کہ بخار سے ہمیں نجات حاصل ہو۔ اس لیے کہ بخار بیماری ہے۔ بیماری

سے انسان کیوں بچتا ہے ۔ کیونکہ تندرستی بیماری سے بہتر ہے ۔ پھر سوال کیا جا سکتا ہے کہ
تندرستی بیماری سے کیوں بہتر ہے ۔ اس کا جواب اس کے سوا نہیں کہ ہم اسے ایسا پاتے ہیں ۔
اگر ہم اس طرح سوالات کا ایک لامتناہی سلسلہ چھیڑ دیں تو آخر کار ہم مجبوراً ایک ایسا نقطہ یا مقام
پر جا کر رک جائیں گے جہاں مزید سوال و جواب کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں
ہمیں زندگی کے لیے چند قطعی اور حتمی اقدار کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا ۔
اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت باسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ احساس اہمیت اور اس کا
نا مکمل ادراک وہ اصل مفروضات ہیں جن پر نسل انسانی نے اپنے مقصد کا قصر تعمیر کیا ہے ۔ یہ عقیدہ
اتنا بنیادی اور فطری ہے کہ انسان نے کبھی بھی اس میں شک نہیں کیا ۔ ڈیکارٹ اور ہیوم کی طرح جس
کسی نے اس سمت میں قدم اٹھایا اسے بالآخر شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ۔
پروفیسر جوڈ نے چونکہ اپنا طرز استدلال اہل مذہب سے مستعار لیا ہے اس لیے وہ اخلاق
کی معروضی قدروں کے متعلق کوئی بات پورے وثوق اور یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکا ۔ اگر وہ قرآن پاک کی
ایک آیت (اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السموات والارض) پر غور کرتا تو فکر و نظر کے بہت سے
گوشے اس کے سامنے بے نقاب ہو جاتے ۔ قرآن مجید اپنے دعویٰ کا آغاز اس حقیقت سے کرتا ہے
کہ ایک علیم و خبیر ہستی پوری حکمت اور تدبر سے اس کارخانۂ حیات کو چلا رہی ہے ۔ دوسرے نسل انسانی
شعوری یا غیر شعوری طور پر خالق کائنات کے ارادہ کے ساتھ اپنے عزائم کو ہم آہنگ کرنے کی سعی کرتی
ہے ۔ یہی جذبہ اس کے افعال کا اصل محرک ہے ۔ اس جذبہ یا اسی خواہش پر نسل انسانی کا معیار خیر و شر
قائم ہے ۔ جب تک ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ یہ ساری کائنات اور اس کی تمام حرکات ایک خالق
مطلق کی کرشمہ سازی ہے اس وقت تک ہمارا کوئی مقصد یا عمل لاتیفک طور پر اچھا یا برا نیک یا بد
ٹھہرایا نہیں جا سکتا ۔ دوسرے الفاظ میں ایک زندہ و جاوید خدا پر ایمان اس امر کا متقاضی ہے کہ ہم
اس کے پیش کردہ معیار خیر و شر کو بھی قبول کریں ۔
اس کے علاوہ جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ذاتِ مطلق اور اس کی صفاتِ کمال موجود ہیں تو

یہ اس حقیقت کا اقرار ہے کہ وہ ہماری ذات سے جداگانہ اپنا ایک الگ اور مستقل وجود رکھتی ہے۔ اس کا وجود نہ تو کسی مخصوص معاشرتی ماحول یا معاشی احوال کا محتاج ہے اور نہ ہمارے اقرار کا دست نگر۔ جس طرح خداوند تعالیٰ اغیر فانی ہے اسی طرح اُس کی پیش کردہ اقدار بھی ازلی و ابدی ہیں۔ ان کی حیثیت "مرغِ بادنما" کی نہیں جو واقعات کے ہر جھونکے کے ساتھ اپنی سمت کو بدلتی رہیں۔ بلکہ اُن کی حیثیت اُس بے لاگ عدالت کی سی ہے جو ازل سے ابد تک قائم ہو، جو ہر دَور اور ہر مقام پر ہر قسم کے خارجی حالات میں لوگوں کو ان کے افکار و اعمال کے متعلق صحیح فیصلہ دے۔ یہ "عدالت" نہ تو ہمارے ذہن کی پیداوار ہے نہ ہمارے معاشی ماحول کا کرشمہ۔ اس کی اپنی الگ اور مستقل حیثیت ہے۔ انسانیت نے اگرچہ تہذیب و تمدن کے بیشمار چولے بدلے ہیں مگر ایک لافانی خدا کے لازوال اصول اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ وہ اَن مٹ اور اٹل ہیں۔ کیونکہ انسانی فطرت جس کو منضبط کرنے کے لیے اس کائنات کے پیدا کرنے والے نے ان کو وضع کیا ہے وہ آج بھی وہی ہے جو سینکڑوں ہزاروں سال پیشتر تھی۔ انسانی فطرت جن ناقابلِ تغیر خصوصیات پر مبنی ہے وہ امتدادِ زمانہ اور تغیر کے باوجود یکساں اور غیر مبدل ہے۔ اس لیے خدا کے پیش کردہ ان غیر تبدّل پذیر اور دائمی حقائق پر ایمان لانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اس ضمن میں ہمیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ذاتِ مطلق اور صفاتِ کمال کا تصور ایک ایسا لازمی تصور ہے جس سے کوئی مفر نہیں۔ ہمارا کوئی فکری عمل ایسا نہیں ہوسکتا جو مطلق کے تصور سے خالی ہو۔ صداقت کے تصور میں صداقتِ مطلق کا تصور لازماً موجود رہتا ہے۔ اسی طرح اقدار کے تصور میں قدرِ مطلق کا تصور ضرور پایا جاتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جزوی صداقت یا ناقص اقدار اور بدلتے ہوئے اخلاقی معیار کے تصورات کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہوسکتا جب تک اس کے ساتھ ایک ایسا تصور موجود نہ ہو جو نہ تو جزوی ہو نہ ناقص اور نہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والا ——— چنانچہ ان ابدی حقائق اور مستقل اخلاقی معیار پر ایمان لانے میں ہی انسانیت کی فلاح کا راز مضمر ہے۔

بات کہیں سے کہیں نکل گئی۔ اس سلسلہ میں مجھے صرف اسی قدر عرض کرنا مقصود ہے کہ فاضل مصنف نے ایک صحیح نقطہ سے آغاز نہ کرنے کی وجہ سے اس مسئلہ کے سارے پہلوؤں کا صحیح طور پر احاطہ نہیں کیا۔ مگر اُس کے مخلصانہ غور و فکر نے اُسے اس نتیجہ تک پہنچا دیا ہے کہ یہ مستقل اخلاقی اقدار ہیں صرف مذہب کی بارگاہ سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ پھر اُس نے جس دیدہ وری سے ان اخلاقی قدروں کو نظر انداز کرنے کے خطرناک نتائج سے بحث کی ہے وہ ہر صاحبِ فکر سے ایک گہرے سوچ بچار کا تقاضا کرتی ہے۔ اُس نے ہمیں بتایا ہے کہ اخلاقی انحطاط نے نوعِ انسانی کے لیے اُن ایجادات کو مہلک بنا دیا ہے جن سے نہایت مفید کام لیا جا سکتا ہے۔ اُس نے بالکل درست کہا ہے :-

"علومِ طبعی نے ہم کو وہ قوت بخشی، جو دیوتاؤں کے شایانِ شان تھی۔ لیکن ہم اسے بچوں اور وحشیوں کی طرح استعمال کر رہے ہیں" (ص ۲۶)

ایک دوسرے موقع پر وہ اس حقیقت کا یوں اظہار کرتا ہے :-

"ہماری حیرت انگیز صنعتی فتوحات اور ہمارے شرمناک اخلاقی بچپن کے درمیان جو عظیم تفاوت ہے اس سے ہمیں ہر موڑ پر سابقہ پیش آتا ہے۔ ایک طرف ہماری صنعتی ترقیوں کا یہ حال ہے کہ ہم اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے سمندر پار سے اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم کے لوگوں سے بے تکلف باتیں کرتے ہیں، سمندر کے اوپر اور زمین کے نیچے دوڑتے ہیں، ریڈیو کے ذریعہ سیلون میں لندن کے بڑے گھنٹے (BIG BEN) کی آواز سن سکتے ہیں۔ ٹیلیفون کے ذریعہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ بے آواز کے ٹائپ رائٹر استعمال کیے جاتے ہیں۔ بغیر کسی درد و تکلیف کے دانت بھرے جا سکتے ہیں۔ جہازوں میں غسل خانے موجود ہیں۔ کھیتیاں بجلی کی مدد سے پکائی جاتی ہیں۔ ربڑ کی سڑکیں تعمیر کی جاتی ہیں۔ ایکس رے کے ذریعے ہم اپنے جسم کے اندرونی حصوں کو جھانک کر دیکھ سکتے ہیں۔ تصویریں بولتی اور ناچتی ہیں، لاسلکی کے ذریعہ مجرموں اور قاتلوں کا سراغ لگایا جاتا ہے، برقی لہروں سے بالوں میں پیچ و خم پیدا کیا جاتا ہے۔ آبدوز کشتیاں قطب شمالی تک اور ہوائی جہاز قطب جنوبی تک پہنچتے ہیں۔ لیکن ان سب

ترقیوں کے باوجود ہم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے بڑے بڑے شہروں میں کوئی ایسا میدان بنا دیں جس میں غریبوں کے بچے آرام و حفاظت کے ساتھ کھیلیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سالانہ دو ہزار بچوں کی جانیں تلف ہو جاتی ہیں اور نوے ہزار زخمی ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں ایک ہندوستانی فلسفی سے اپنے تمدن کے عجائبات کی تعریف کر رہا تھا۔ اسی زمانہ میں ایک موٹر چلانے والے نے تین سو یا چار سو میل کی مسافت ایک گھنٹہ میں طے کر کے ریکارڈ قائم کیا تھا، یا کسی ہوا باز نے ماسکو کی مسافت . . . مجھے صحیح طور پر یاد نہیں بیس گھنٹہ میں یا پچاس گھنٹہ میں طے کی تھی۔ جب میں یہ سب کچھ کہہ چکا تو ہندوستانی فلسفی نے کہا ہاں یہ صحیح ہے کہ تم ہوا میں پرندوں کی طرح اُڑتے ہو، پانی میں مچھلیوں کی طرح تیرتے ہو لیکن ابھی تک تمہیں زمین پر انسانوں کی طرح چلنا نہیں آیا۔" (ص ۲۶۳)

مصنوعات و ایجادات اپنی جگہ پر بے ضرر اور غیر جانبدار ہیں۔ اُن کو بُرے مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور نیک مقاصد کے لیے بھی۔ اپنی ذات کے اعتبار سے وہ نہ خیر ہیں نہ شر۔ انسان کی تملیکی ذہنیت (ACQUISITIVE MENTALITY) نے انہیں تباہی کے لیے استعمال کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے :-

"انسان کی اخلاقی قوت کے مقابلہ میں سائنس کی قوت کہیں زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ اولادِ آدم کا فطرت پر کنٹرول اُس کے لیے ہلاکت انگیز ثابت ہو رہا ہے۔"

"ہمیں علم طب نے اس امر کی توفیق دی ہے کہ ہم انسانی زندگی کی میعاد بڑھا دیں مگر اس کے ساتھ ہی علم کیمیا نے ایسے آلات بھی ایجاد کیے ہیں جن سے انسانی زندگی کا جلد از جلد خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔"

"ہم بلا شبہ بڑی سُرعت تیز رفتاری سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کر سکتے ہیں۔ مگر جن مقامات کا ہم سفر کرتے ہیں وہ بہت کم اس قابل ہیں کہ ان کی طرف سفر کیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاحوں کے لیے زمین سمٹ گئی ہے اور اس کی طنابیں کھنچ گئی ہیں

قومیں ایک دوسرے کے نزدیک تر ہو گئی ہیں۔ اُن کے پاؤں ایک دوسرے کی دہلیز پر ہیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوموں کے باہمی تعلقات پہلے سے زیادہ ناخوشگوار ہیں، وہ وسائل جن سے ہم اپنی ہمسایہ قوموں سے براہ راست واقف ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے اُلٹا دنیا کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا ہے۔ ہم نے آواز پہنچانے کا آلہ ایجاد کیا اور اس کے ذریعہ اپنی ہمسایہ قوموں سے باتیں کیں لیکن اس کا انجام یہ ہے کہ آج ہر قوم ہوا کے سارے وسائل کو صرف اپنی ہمسایہ قوم کو زک پہنچانے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ وہ ہمیشہ اس کوشش میں مصروف رہتی ہے کہ دوسری قوم کو اپنے سیاسی نظام کی برتری کا قائل کردے" (ص ۲۴)

"انسانی عقل اور قوت کے درمیان تفاوت کی ایک اور نشانی ہوائی جہاز ہے۔ آپ اسے فضائے آسمانی میں اُڑتے دیکھ کر یہیں خیال ہو گا کہ اس کے موجد اپنے علم و مہارت، صنعت اور کاریگری کے لحاظ سے مافوق البشر ہستیاں تھیں اور جنہوں نے اس پر سب سے پہلے پرواز کی۔ وہ بلاشبہ بلند ہمتی، عزم اور جرأت کے اعتبار سے قابل داد اور لائق تحسین ہیں۔ لیکن اب ذرا ان مقاصد کا جائزہ لیجیے جن کے تحت یہ ہوائی جہاز استعمال ہو رہے ہیں۔ وہ مقاصد کیا ہیں؟ فضائے آسمانی سے بمباری، انسانوں کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا، زندوں کا گلا گھونٹنا، انسانی جسموں کو جلا دینا، زہریلی گیسوں کا پھینکنا اور ان کمزوروں کو ریزہ ریزہ کرنا جن کے پاس اس آفت سے بچنے کا کوئی سامان نہیں۔ یہ مقاصد یا تو احمقوں کے ہو سکتے ہیں، یا شیاطین کے۔" (ص ۲۶۳)

پروفیسر جوڈ نے قوم پرستی کی ستم رانیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ عہد حاضر کا امپیریلزم اسی قوم پرستی کا شاخسانہ ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:۔

"قومی عظمت کا مطلب یہ ہے کہ قوم کے پاس ایسی طاقت ہو جس سے وہ بوقت ضرورت اپنی خواہش کو دوسروں سے بالجبر منوا سکے۔ یہ امر کہ قومی عظمت اخلاق سے بالکل بے تعلق ہو ایک ایسا آئیڈیل ہے جس کو کبھی بھی پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اگر کسی

ملک ایسا ہے جو صرف سچ ہی بولتا ہے، وعدے وفا کرتا ہے اور کمزوروں کے ساتھ انسانیت کا سلوک کرتا ہے تو ان قوموں کے نزدیک اس کی کوئی عزت نہیں۔ مسٹر بالڈون کے قول کے مطابق عزت نام ہے اس قوت کا جس سے قوم خاص شرف و اعتبار کی مالک ہو، اور دوسروں کی نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرے اور ظاہر بات ہے کہ ایسی قوت جس سے قوم کو ایسا اعزاز و امتیاز حاصل ہو موقوف ہے آتش فشاں گولوں اور بموں پہ، ان نوجوانوں کی وفاداری اور وطن دوستی پر جن کا شہروں پر ان گولوں اور بموں کو پھینکنا محبوب مشغلہ ہے۔ پس جس عزت کے لیے کسی قوم کی تعریف کی جاتی ہے وہ ان صفات و اخلاق کے بالکل ضد واقع ہوتی ہے جن کی بنا پر فرد کی تعریف کی جاتی ہے، میرے نزدیک تو قوم کو اسی قدر وحشی اور غیر مہذب سمجھنا چاہیے جس قدر وہ ایسی عزت کی مالک ہو، فریب دہی، دغا بازی اور ظلم سے عزت حاصل کرنا کسی انسان اور قوم کے لیے "قطعی" باعث عزت نہیں"۔

پھر اپنی اپنی قوموں کو سرگرم عمل رکھنے کے لیے اُن کے رہنما نہایت ہی عیاری سے اُن کے دلوں میں دوسری قوم کے خلاف نفرت کے جذبات بھڑکاتے رہتے ہیں۔ انہیں یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہے کہ قوم پرستی کا جوش اُس وقت تک قائم نہیں رکھا جا سکتا جب تک کہ قوم کے سینہ میں نفرت اور خوف و ہراس کو اچھی طرح پالا نہ جائے۔ چنانچہ پروفیسر جوڈ نے اس کی جو فلسفیانہ اور نفسیاتی تحلیل و توجیہ کی ہے وہ حسب ذیل ہے :-

" وہ مشترک جذبات جن کو بڑی آسانی سے برانگیختہ کیا جا سکتا ہے اور جو جمہور کی بڑی بڑی جماعتوں کو حرکت میں لا سکتے ہیں وہ رحم، فیاضی اور محبت کے جذبات نہیں بلکہ نفرت اور خوف کے جذبات ہیں۔ جو لوگ کسی قوم پر کسی مقصد کے لیے حکمرانی کرنا چاہتے ہیں وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک اس کے لیے کوئی ایسی چیز تلاش نہ کریں جس سے وہ نفرت کرے اور اس کے لیے کوئی ایسی شخصیت یا قوم نہ پیدا کریں جس سے وہ ڈرے۔ میں اگر قوموں کو متحد کرنے کا عزم رکھتا ہوں تو مجھے چاہیے کہ میں اُن کے لیے کسی اور سیارہ پر کوئی

دشمن تلاش کروں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مثلاً چاند پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس سے یہ سب قومیں خائف ہوں ۔
انہی جذبات پر حکمرانوں کی زندگی موقوف ہے اور انہی جذبات پر قومی اتحاد کی بنیاد۔" (ص ۱۵)
آج کل دنیا کی سیاسی فضا میں اتحاد اور امن کے جو نعرے لگائے جا رہے ہیں انہیں وہ ایک خوفناک فریب سے تعبیر کرتا ہے ۔ اس صلح پسندی کو وہ ڈاکو کی صلح پسندی خیال کرتا ہے جو اپنا قدیم پیشہ ترک کر چکا ہے اور اپنے سابقہ مال غنیمت سے عزت اور جاہ حاصل کر چکا ہے ۔ وہ ان لوگوں کو ناپسند کرتا ہے جو اس کے قدیم پیشہ کو اختیار کرنا چاہتے ہیں ۔

فاضل مصنف نے صرف مغربی تہذیب کی ناکامیوں کا تذکرہ کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اُس نے اس کے اسباب کا بھی نہایت عمدگی سے تجزیہ کیا ہے ۔ اس سلسلہ میں وہ کہتا ہے :۔

"اس وقت نوعِ انسانی کے سامنے صنعتی تعلیم کا مسئلہ نہیں ، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس نے سائنس سے جو قوت حاصل کی ہے اُسے وہ کیونکر صحیح طور پر استعمال کرے ۔ اس اُلجھن کو سائنس حل نہیں کر سکتی ۔ لہٰذا میں یہ بات پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ تہذیب جدید کے پیش نظر اس وقت قوت کا مسئلہ نہیں بلکہ اخلاق کا مسئلہ ہے ۔ اخلاقی پیمانوں سے ہی ہم انسانی ترقی کا صحیح طور پر اندازہ لگا سکتے ہیں ۔ جہاں تک انسان کے حیاتیاتی پہلو کا تعلق ہے اُس میں مزید ترقی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ۔ مگر اخلاقی اور روحانی اعتبار سے ابھی اس کے بےشمار امکانات ہیں ۔" (ص ۲۵۷)

چنانچہ اُس نے "وقت کی اہم ضرورت" پر بحث کرتے ہوئے نہایت واضح الفاظ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ :۔

"دورِ جدید کا بیمار انسان جس امرت رس کو حاصل کرنے کے لیے آوارہ و سرگردان ہے، وہ ایک ایسا مذہب ہے جو ایک طرف تو اُسے اخلاق کی معروضی قدریں دے ، اور اس کے ساتھ ہی اُسے ان سے عملی زندگی میں فائدہ اٹھانا بھی سکھلائے ۔ انسانیت کی کامیابی اسی سے وابستہ ہے ۔"

(بقیہ رسائل و مسائل)

تحویل میں دیے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ ملک کی پیداوار کو ایک منصوبہ کے تحت بڑھانے کے لیے اور بھی کئی طریقوں سے کام لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ٹیکسوں، گاڑیوں کے کرایوں، اور درآمد و برآمد کی پالیسی کے ذریعہ لوگوں کی توجہ بعض چیزوں کی پیدائش سے ہٹا کر دوسری طرف لگائی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ پریس اور پراپیگنڈے سے بھی یہ کام لیا جا سکتا ہے۔

آپ کو اس سلسلہ میں جو غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے پیش نظر ایک ایسی قومی حکومت کا تصور ہے جس کے ہر شہری کے سامنے پیداوار بڑھانے اور نفع کمانے کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد نہیں۔ اس لیے اس کی پیداوار کو ایک منصوبہ کے تحت ترقی دینے کی اشد ضرورت ہے۔ منصوبہ بندی کی افادیت سے مجھے انکار نہیں مگر جس خطرہ کے پیش نظر آپ اس سلسلہ میں مضطرب ہیں وہ خطرہ مجھے اسلامی ریاست میں نظر نہیں آتا۔ مغربی قوموں کو اس کی شدید ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ان کے سامنے سوائے نفع اندوزی کے اور کوئی دوسرا مقصد نہ تھا۔ چنانچہ انہیں جس کام میں نفع کی سب سے زیادہ گنجائش نظر آئی اس کے پیچھے دیوانہ وار پڑ گئے۔ اگر انھوں نے یہ دیکھا کہ کپڑے سے زیادہ شراب میں نفع حاصل ہوتا ہے تو انہوں نے وہ کام چھوڑ کر یہ شروع کر دیا اور اس بات کی مطلق پروا نہ کی کہ اس سے قوم کو کس قدر نقصان پہنچتا ہے۔ اس وجہ سے یورپ میں آج کل منصوبہ بندی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

آپ خود اندازہ لگائیں کہ کیا اسلامی ریاست میں بھی یہی صورتِ حالات ہو گی۔

پھر اس معاملہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ ہر قوم منصوبہ بندی میں سب سے زیادہ اہمیت اپنے بنیادی مقصد کو دیتی ہے۔ اس کو ایک منصوبہ کے تحت ڈھالنے سے زندگی کے باقی شعبے از خود منظم اور منضبط ہو جاتے ہیں۔ اسلامی ریاست جب اپنے بنیادی مقصد معروف کے قیام، اور فسق و فجور کے استیصال کے لیے منصوبہ بنائے گی تو زندگی کے دوسرے شعبے خود بخود ایک تنظیم میں ڈھل جائیں گے۔

سرورق جدید اردو ٹائپ پریس' لاہور میں چھپا

سود حصہ اول

ایک مدت سے یہ کتاب ختم تھی اب اسکا نیا ایڈیشن شائع ہوگیا ہے۔ سود آج کی معاشیات میں ایک نہایت اہم جز و بلکہ سنگ بنیاد کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے سرمایہ داری اشتراکیت اور اسلامی نظم معیشت کا مختصر سا جائزہ لیکر اس کتاب میں ان تینوں نظریات کا اصولی فرق واضح کیا ہے اور اسلامی نظریہ معیشت کو بالتفصیل بیان کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سود کسی شکل میں بھی اس نظام معیشت میں کوئی جگہ نہیں پاسکتا اور معیشت کے ارتقاء سے جو نئے مسائل پیدا ہوگئے ہیں انہیں سود کے بغیر حل کیا جا سکتا ہے۔ علم معیشت کے طالبعلموں کے لئے ایک نہایت معلومات افزا کتاب ہے۔ قیمت تین روپے

"سود" حصہ دوم

سود حصہ اول کے نا مکمل مباحث کو مولانا مودودی نے اس کتاب میں مکمل کر دیا ہے۔ اسمیں وقت کے مختلف معاشی نظریات اور انکے تاریخی پس منظر کا پوری تفصیل سے جائزہ لینے کے بعد اس بنیادی خرابی کی نشاندھی کی گئی ہے جسکی وجہ سے یہ تمام نظرئیے انسانیت کی کوئی خدمت کرنے کے بجائے نئے مسائل اور الجھنیں پیدا کر رہے ھیں جنمیں سب سے اہم سود کا مسئلہ ہے۔ معاشیات کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کے لئے سود کے موضوع پر ایک ناگزیر کتاب۔ قیمت تین روپے

پردہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی معرکۃ الاراء تصنیف پردہ کا نیا ایڈیشن چھپ کر آگیا ہے۔ اس جامع کتاب میں مختلف تہذیبوں کے عروج و زوال اور تاریخ تمدن کا تفصیلی جائزہ لیکر فاضل مصنف نے یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ جب کسی معاشرہ میں مردوزن کا اختلاط حدود مذہب و اخلاق کو پھاند جاتا ہے تو اسکی تباہ کاریاں کس طرح پوری قوم کو بالکل کھوکھلا اور نکما بنا کر رکھ دیتی ھیں اسلام اسی خطرہ کے سدباب کے لئے پردہ کا حصار قائم کرتا ہے۔ تفصیلات کیلئے اصل کتاب ملاحظہ فرمائیں۔

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ دیدہ زیب گرد پوش . . . . قیمت چار روپے

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

شاہ ولی اللہ صاحب دھلوی کے ایک اہم رسالہ کو مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی نے نہایت شستہ اردو میں ترجمہ کیا ہے شاہ صاحب نے اپنے اس رسالے میں مختلف فقہی مذاہب کے ارتقاء اور تاریخی پس منظر کا تفصیلی جائزہ لیکر واضح کیا ہے کہ ابتداء میں یہ اختلافات کس نوعیت کے تھے اور آج ان کو کیا شکل دیدی گئی ہے نیز آپنے ان مختلف فقہی مسلکوں سے پورا فائدہ اٹھانے اور دین کو سمجھنے میں انسے مدد لینے کے لئے ایک راہ اعتدال بھی پیش کی ہے۔ قیمت ڈھائی روپے

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ ۔ لاہور

سویرا جدید اردو ٹائپ پریس، لاہور میں چھپا